حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔ ۲۷

راسخ عظیم آبادی

پروفیسر رئیس انور

Monograph-27

Rasikh Azimabadi

By : *Prof. Rais Anwer*

راسخ عظیم آبادی کا پورا نام شیخ غلام علی اور راسخ تخلص کرتے تھے۔ راسخ کی جائے پیدائش اکثر تذکرہ نویسوں کے مطابق عظیم آباد سے کچھ فاصلے پر واقع موضع سائیں ہے۔ وہ سادہ طبیعت، فقیرانہ مزاج، سیرت و خصلت اور طرز معاشرت کے اعتبار سے سیمابی کیفیت کی حامل شخصیت تھی۔

انہوں نے صوفیانہ اور قلندرانہ زندگی گذاری۔ ان کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ خانقاہوں اور درگاہوں میں بیٹھ کر اپنا صوفیانہ کلام خوب شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ ان کو خانقاہوں اور بزرگوں سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔ ولیوں کے روحانی فیض پر یقین رکھتے تھے۔

راسخ مرور زمانہ اور بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے مالی بدحالی کا شکار ہوئے۔ وہ نوکری اور ملازمت کے پیشہ کو کسر شان سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوئی نوکری اور ملازمت نہیں کی۔ مالی بدحالی سے پریشان ہو کر دہلی کا رخت سفر باندھا لیکن راستے میں غازی پور کے ادب نوازوں اور بہی خواہ دولت مندوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور بڑی خاطر تواضع کی۔ تقریباً تین سال غازی پور میں رہ کر وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی ادبی تربیت کی اور وہاں ادبی ماحول قائم کیا۔

راسخ شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے۔ انہیں لفظوں کے استعمال پر کامل عبور تھا۔ نرالے اسلوب اور دلکش تراکیب میں خیال کو شگفتگی اور حسن کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ خیال کے اظہار میں بے ساختگی، برجستگی اور شگفتگی صاف محسوس ہوتی۔ عظیم آباد کے مشاعروں اور شعری محفلوں میں راسخ کی ایک باوقار پہچان بن گئی تھی۔ وہ ایک روایت پرست اور راست گو شاعر تھے۔ وہ نظم و ضبط اور تہذیب کے علمبردار تھے۔ ان کے شعر پڑھنے کے دلکش انداز اور خوبصورت پیشکش سے سامعین بہت متاثر ہوتے۔ فقیرانہ مزاج کے باوجود مشاعروں کے آداب ملحوظ رکھتے۔

راسخ کی زندگی میں عشق و محبت کے واقعات بھی ملتے ہیں جو ان کی مثنوی ''گنجینۂ عشق'' میں موجود ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے محبوب کا نام لے کر اس کی خوبصورتی، حسن و جمال اور عشق و محبت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے باکمال شاعر تھے۔ اپنے دور کے تمام مروجہ اصناف سخن غزل، مثنوی، مرثیہ، مسدس، قصیدہ، واسوخت، مخمس، رباعی، قطعہ اور ہجو میں طبع آزمائی کی۔ ان میں انہیں خاصی مہارت حاصل تھی۔

انہوں نے اپنے استاد فدوی، میر اور اہم پیش رو سودا اور درد کے فکری اور اسلوبیاتی میلان سے اپنی شاعری کو ہم آہنگ کیا اور اپنے شاگردوں کی تربیت اسی نہج پر کی۔

انہوں نے مختلف شہروں میں قیام کیا اور 60/سال کی عمر میں مستقل طور پر عظیم آباد میں سکونت پذیر ہوئے اور یہیں ان کا انتقال بروز پیر 20/جمادی الاول 1238ھ بمطابق 1822ء کو ہوا اور عظیم آباد میں مدفون ہوئے۔ ان کا مزار عظیم آباد کے محلّہ لودی کٹرہ، رضا لین کی دکھن جانب کے قبرستان میں اب بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر رئیس انور معتبر اور معروف محقق، مشہور ناقد، کامیاب تبصرہ نگار، تجربہ کار مترجم، کہنہ مشق ادیب و شاعر ہیں۔ انہوں نے کئی میڈل حاصل کیے ہیں۔ وہ تحقیقی، تدریسی اور انتظامی سرگرمیوں میں نہ صرف بہار بلکہ بہار کے باہر مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں میں قابل قدر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کی گرانقدر ادبی خدمات کے اعتراف میں بنگال اور بہار کے اردو اکادمیوں نے انہیں انعامات سے نوازا۔ ان کی کتاب ''بہار میں ناول نگاری''، 2011ء پر بہار سے پہلا انعام اور اتر پردیش اردو اکادمی سے دوسرا انعام ملا۔ ''تنقیدی مرحلے'' اور ''بنگال کے اردو تذکرے'' منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔ انہوں نے للت نارائن متھلا یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو رہتے ہوئے ایک مجلّہ شائع کیا، جس میں شعبے اور دوسرے کالجوں کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کے مضامین آپ کی نگرانی میں شائع ہوئے۔ راسخ عظیم آبادی کی شخصیت و شاعری پر ان کا یہ فرد نامہ پوری تحقیق اور سلیقے سے لکھی ہوئی قابل قدر تصنیف ہے۔ اس کے مطالعہ سے راسخ فہمی میں مدد ملتی ہے اور ان کی مجموعی ادبی قدر و قیمت روشن ہوتی ہے۔

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

شاگردِ میرؔ

راسخ عظیم آبادی

پروفیسر رئیس انور

طابع و ناشر:

اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۲۷

Rasikh Azimabadi

By

Prof. Rais Anwer

نام کتاب	:	رشید النساء
مصنف	:	پروفیسر رئیس انور
سال اشاعت	:	2023ء
کل صفحات	:	126
کمپوزنگ و تزئین	:	گلیکسی کمپیوٹرس، رحم خاں، دربھنگہ
سرورق	:	روائل کمپیوٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔ ٦

ملنے کا پتہ

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱

فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	پروفیسر رئیس انور	6
راسخ عظیم آبادی: ایک نظر میں	—	9
حیات و شخصیت	—	10
تصنیف و تالیف (خطی اور مطبوعہ نسخے)	—	22
معاصرین و تلامذہ	—	28
شاعری	—	32
• غزل گوئی		
• مثنوی نگاری		
• قصیدہ نگاری		
• مرثیہ نگاری		
• رباعی نگاری		
حواشی	—	68
راسخ عظیم آبادی۔ ادیبوں کی نظر میں	—	70
راسخ عظیم آبادی پر مطبوعہ کتابیں	—	78
کتابیات	—	81
انتخاب کلام	—	83
غزلیات، منتخب اشعار، رباعیات، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، مخمس، واسوخت، قطعات، ہجو	—	84

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری و ادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعر و ادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، شوق نیموی، فضلِ حق آزاد، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجز، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری و ادبی عظمت و اہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری و ادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعر و ادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنا اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں تیئس (۲۳) مشاہیر ادب بہار ۱۔ شاد عظیم آبادی، ۲۔ پرویز شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہی، ۵۔ علامہ واقف عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمز عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفرپوری، ۱۰۔ کلیم عاجز، ۱۱۔ غیاث احمد گدی، ۱۲۔ جمیل مظہری، ۱۳۔ انجم مانپوری، ۱۴۔ بیتاب صدیقی، ۱۵۔ عبدالغفور شہباز، ۱۶۔ فضل حق آزاد، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ کلام حیدری، ۱۹۔ اویس احمد دوراں، ۲۰۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۱۔ امداد امام اثر، ۲۲۔ احمد یوسف، ۲۳۔ صدیق مجیبی کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا۔

راسخ دبستان عظیم آباد کے بنیاد گذاروں میں ہیں۔ 18 ویں صدی کے اختتام اور 19 ویں صدی کے آغاز کے اہم اور مشہور شعراء میں ان کا شمار ہے۔ راسخ نے میر کی شاگردی اختیار کی۔ راسخ کے ذہن ودماغ اور شاعری پر میر کا اثر نظر آتا ہے۔ جب میر، درد، سوز اور مرزا دبستان دہلی کے افق پر چمک رہے تھے اور داد وتحسین حاصل کررہے تھے، اس دور میں راسخ دبستان عظیم آباد کی آبیاری کررہے تھے۔ چونکہ دبستان دہلی کو معیار اور مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اس لیے شعراء کرام اپنے کلام کو معیاری بنانے کے لئے دہلی کا اثر قبول کررہے تھے۔ راسخ نے بھی اثر قبول کیا۔ راسخ نے اپنے دور کے سبھی مروجہ اصناف سخن غزل، مثنوی، مرثیہ، مسدس، قصیدہ، واسوخت، مخمس، رباعی، قطعہ اور ہجو میں طبع آزمائی کی۔ راسخ کی شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کے رنگ ملتے ہیں لیکن عشق حقیقی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ راسخ پر ڈاکٹر رئیس انور کا یہ فردنامہ تحقیق اور عرق ریزی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

اس فردنامہ کے مصنف ڈاکٹر رئیس انور ایک کہنہ مشق ادیب، شاعر، افسانہ نگار، محقق، معتبر ناقد اور کامیاب تبصرہ نگار ہیں۔ وہ للت نارائن متھلا یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمت انجام دے چکے ہیں۔ انہوں نے تحقیقی، تدریسی اور انتظامی سرگرمیوں میں بہار اور بہار کے باہر مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں میں قابل قدر خدمات انجام دیا ہے۔ ان کی کئی معتبر بیش قیمتی اور قابل مطالعہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ انہوں نے یہ فردنامہ بڑی تحقیق اور عرق ریزی کے ساتھ رقم کیا ہے۔ ڈاکٹر رئیس انور کا مرقوم یہ فردنامہ راسخ عظیم آبادی کی شخصیت فہمی اور اصناف سخن میں ان کی خدمات کا کامل اور کامیاب احاطہ کرتا ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ فردنامہ راسخ فہمی میں معاون ثابت ہوگا۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیشکش آپ قارئین کو پسند آئے گی۔

احمد محمود
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

سرزمین بہار کے کئی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور دبستان عظیم آباد کی ایک الگ شناخت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں شیخ غلام علی راسخ عظیم آباد کی کلیدی حیثیت ہے۔ انہوں نے دہلوی دبستان شاعری کی داخلیت کا ایک نیا رنگ نہ صرف مقامی طور پر متعارف کرایا بلکہ اس کی ترویج واشاعت کے لیے ماحول بھی بنایا۔ وہ اپنے پیش رو محمد تقی میر کی داخلیت اور حزنیہ لے سے اتنا متاثر تھے کہ اپنی شاعری کا آہنگ اور لہجہ اسی نہج پر استوار کیا۔ یوں تو وہ ایک بلند پایہ غزل گو ہیں مگر انہوں نے کم وبیش تمام اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ضخیم دیوان/کلیات بنیادی طور پر ردیف وار غزلوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں اس میں طویل ومختصر مثنویاں، حمدیہ، نعتیہ اور شخصی قصیدے، منقبت، مرثیے، رباعیاں، قطعات، مخمس، واسوخت اور ہجو موجود ہیں۔

راسخ عظیم آبادی کے دیوان/کلیات اور انتخاب کلام کے کئی خطی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان کا کلیات پہلی بار ۱۸۹۳ء میں عظیم آباد سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے ان کے دیوان (بخط شاعر) کا عکس ۱۹۹۴ء میں اور دوسرے خطی نسخے کی تدوین و اشاعت ۲۰۰۶ء میں ہوئی۔ پروفیسر ممتاز احمد (سابق صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی) نے پروفیسر کلیم الدین احمد کی رہنمائی میں 'مثنویات راسخ' پر تحقیق وتدوین کی تھی۔ اس مقالے پر انہیں ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور کتاب بھی اسی سال شائع ہوئی۔ نامور شاعر اور نقاد پروفیسر لطف الرحمٰن نے ۱۹۷۱ء میں 'راسخ بحیثیت غزل گو' پر پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی تھی۔ ان کے نگراں پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن تھے۔

پروفیسر لطف الرحمٰن نے ایک مونوگراف 'راسخ عظیم آبادی' بھی لکھا تھا جو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ اسی لئے میں نے زیر نظر مونوگراف کا نام 'شاگرد میر: راسخ عظیم آبادی' کردیا ہے تاکہ اس کی علیحدہ پہچان ہو سکے۔

بہر حال اب تک راسخؔ پر جتنا تحقیقی وتنقیدی کام ہوا ہے اور چھپ کر منظر عام پر آیا ہے، وہ ان کے ادبی قد و قامت کے لحاظ سے کم ہے۔ ان کے موروثی وطن، خاندان، حیات اور ازدواج وغیرہ کے متعلق مزید تفتیش کی از حد ضرورت ہے۔ میں نے اس مونوگراف میں مختلف خطی نسخوں، مطبوعہ تذکروں، کتابوں اور مضامین وغیرہ کا تحقیقی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے اور ان کے حوالے سے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی مقدور بھر سعی کی ہے۔ یہ نکتہ بھی واضح کیا ہے کہ راسخؔ نے میرؔ کے رنگ میں شاعری ضرور کی ہے مگر وہ نرے مقلد نہیں ہیں۔ میرؔ کی شاگردی سے پہلے ہی وہ فدویؔ کے زیر سایہ شعری زبان، بیان اور طرز میں پختگی حاصل کر چکے تھے۔

مونوگراف کا آغاز 'راسخ۔ ایک نظر میں' سے ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر قارئین کے ذہن میں ان کی حیات، ماحول اور شاعری کا ایک ہیولیٰ ابھرے گا اور پوری کتاب کے مطالعے کی طرف انہیں راغب کرے گا۔

اس کے بعد بالترتیب راسخؔ کی حیات و شخصیت، تصنیف و تالیف، معاصرین و تلامذہ اور امتیازاتِ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تخلیقی توانائی کی بہترین عکاسی غزلوں، مثنویوں، قصیدوں، مرثیوں اور رباعیوں میں ہوئی ہے۔ لہٰذا ان ہی پر تحقیقی وتنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

راسخؔ کی شاعری پر کئی نامور ادیبوں کی تحریریں ملتی ہیں۔ اختتامی حصے میں ان تحریروں کے اہم اقتباسات درج ہیں۔ پھر ان کی شخصیت وشاعری پر مطبوعہ کتابوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ مونوگراف کی یہ تجزیاتی شق کتابیات پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک جامع اور رنگا رنگ انتخاب کلام ہے جس کے مشتملات میں سب سے پہلے ہر ردیف کی ایک غزل کا اندراج ہوا ہے کہ صنف غزل میں ردیف کی پابندی کے ساتھ اپنا فکری رجحان اور لب ولہجہ برقرار رکھنا معراج فن ہے۔ غزلوں کے بعد منتخب غزلیہ اشعار، رباعیات اور قطعات کے علاوہ دوسری اصناف یعنی مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، مخمس، واسوخت اور ہجو کے ایک ایک نمونے درج ہیں۔ اس طرح قارئین راسخؔ کی شعری تخلیقات کے گونا گوں روپ رنگ سے کماحقہ واقف ہوسکیں گے اور قرأت متن سے محظوظ و مستفیض بھی ہوں گے۔

میں اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار کے فعال ڈائرکٹر جناب احمد محمود کا ممنون ہوں کہ انہوں نے دبستان عظیم آباد کے اوّلین معمار راسخؔ عظیم آبادی پر مونوگراف لکھنے کی ذمہ داری مجھ جیسے گوشہ نشیں اور

ادبی گروہوں سے الگ تھلگ رہنے والے شخص کو دی۔ امید ہے اس علمی کام سے ان کا اعتماد برقرار رہے گا۔

اردو کے قابل قدر قلمکار ڈاکٹر محسن رضا رضوی (صدر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پٹنہ) کی معاونت اور ادب نوازی کا شکریہ ادا کرنا لازمی ہے کہ انہوں نے بڑی فراخدلی سے دو متعلقہ کتابیں اور ایک کتاب کے چند اوراق کا عکس مجھے ارسال کیا جس سے کام کرنے میں سہولت ہوئی۔

معروف شاعر ڈاکٹر جمال اویسی کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کے فراہم کردہ چند صفحات بڑے کار آمد ثابت ہوئے۔

آدمی خطا اور نسیاں کا مجموعہ ہے اور اس کا کوئی بھی کام غلطیوں اور بھول چوک سے پاک نہیں ہوتا ہے۔ مونوگراف کے حقائق کی پیشکش میں اگر مجھ سے فروگذاشتیں سرزد ہوئی ہوں تو اہل علم اس کی نشاندہی ضرور کردیں۔

پروفیسر رئیس انور

راسخ عظیم آبادی: ایک نظر میں

نام	:	شیخ غلام علی
تخلص	:	راسخ
والد	:	شیخ محمد فیض
سال پیدائش	:	۱۱۶۲ھ سے ۱۱۷۱ھ (۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۷ء) کے درمیان
جائے پیدائش	:	عظیم آباد (پٹنہ صاحب/سیٹی) یا موضع سائیں، ضلع پٹنہ
جائے اجداد	:	دلّی (شاہجہاں آباد)
سیاحت اور عارضی قیام	:	غازی پور، بنارس، لکھنو، مونگیر، بھاگلپور، مرشد آباد، کلکتہ
سلسلہ شاگردی	:	مرزا محمد فدوی عظیم آبادی اور محمد تقی میر
اصناف شاعری پر طبع آزمائی	:	غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، واسوخت، مخمس، قطعہ، ہجو
تصنیف وتالیف	:	(۱) کلیات اردو (۲) اشعار فارسی (۳) مکتوبات فارسی/اردو
		(۴) رسالہ درفن عروض مسماۃ بہ خلاصۃ الخلاصہ
برادر خرد	:	شیخ طالب علی طالب (وفات ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء)
تلامذہ	:	(۱) خواجہ محمد محسن (۲) انور علی یاس آروی (۳) حکیم ابوالحسن محزوں
		(۴) مرزا مراد بخش مراد (۵) حکیم احمد حسین حکیم
		(۶) خواجہ فیض اللہ فرحت (۷) نواب سید مہدی علی خاں مہدی
		(۸) شیخ محمد قائم نثار
اہم معاصرین	:	مرزا دانش علی دانش، کلیان سنگھ عاشق عظیم آبادی، جرأت، مصحفی،
		انشا، نظیر اکبر آبادی، فورٹ ولیم کالج کے منشیان
وفات	:	سوموار کے دن، ۲۰ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء
مدفن	:	محلّہ لودی کٹرا قبرستان، پٹنہ صاحب/سیٹی (بہار)

حیات اور شخصیت

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی بہت اہم ہے کہ اسی عرصے میں اردو کی ادبی سرگرمیاں جنوبی ہند سے شمالی ہند کی مختلف ریاستوں میں منتقل ہوئیں۔قدیم شعری اسلوب نکھر سنور کر ایک ایسے پائیدار، لالہ زار اور سدابہار اسلوب میں سما گیا ہے جسے سارے ملک میں اپنا لیا گیا۔اردو شاعری کے دو بنیادی دبستان دہلی اور لکھنو بنے۔ان ہی کے زیر اثر عظیم آباد، مرشد آباد، کلکتہ، لاہور، رام پور اور بھوپال قابل ذکر ادبی مرکز کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔علاوہ بریں شاعروں کی منفرد تخلیقی کاوشوں اور فنی اجتہادات سے اٹھارہویں صدی میں عظیم آباد تیسرے دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا۔

دبستان عظیم آباد کے جن بنیاد گزار شاعروں نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں اپنی پہچان بنانا شروع کی، ان میں راسخ سب سے اہم اور ممتاز ہیں مگر ان کی زندگی کے متعلق اب تک کوئی خاص مواد نہیں مل سکا ہے۔کئی معاصر تذکرہ نگاروں نے یا تو انہیں بالکل نظر انداز کیا ہے یا خانہ پری کے دو چار جملوں پر اکتفا کیا ہے۔صرف تین تذکروں 'تذکرۂ شورش' 'تذکرہ عشقی' اور 'مسرت افزا' میں کام کی باتیں ملتی ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے بھی 'نوائے وطن' میں بعض اہم حقائق کی بازیافت کی ہے مگر بعد کے تذکروں اور کتابوں میں بہت سی سنی سنائی باتیں لکھ دی گئی ہیں۔راسخ نے اپنے چند شعروں میں اشارے کنائے میں اپنے ذاتی احوال پر ہلکی پھلکی روشنی ڈالی ہے، ذیل میں ان ہی بنیادی و ثانوی مصادر سے ان کے سوانحی حالات کا ایک خاکہ ترتیب دیا گیا ہے۔

راسخ نے اجداد کے متعلق اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک نامکمل دیوان میں جستہ جستہ دو تین شعر کہے ہیں اور ایک شخص 'شیخ بلند' کا ذکر کیا ہے جو علم نجوم کے ماہر تھے۔ نیز انہوں نے اپنے پرکھوں کو ذی اقتدار بتایا ہے۔دیکھئے ان کے مذکورہ اشعار:۔

میرے بزرگوں میں تھے ذی اقتدار   بادشاہوں کے سبب ذی افتخار

مملکت ہند میں تھی اُن کی دھوم　　افضلِ خلق، اکملِ علم نجوم
بخت کی میرے تو رسا تھی کمند　　حضرتِ مغفور وہ 'شیخ بلند'

قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق شیخ بلند نام کے ایک شخص کی شاہ عالم کے دربار میں رسائی تھی۔ (1) مگر ان باتوں سے راسخ کا شیخ بلند سے رشتہ واضح نہیں ہوتا ہے۔ ان کے بزرگوں کا تعلق دہلی سے تھا۔ ان کے دادا وہاں سے ترک وطن کر کے عظیم آباد (موجودہ پٹنہ صاحب یا سیٹی) آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ راسخ کا نام شیخ غلام علی تھا۔ وہ شیخ محمد فیض کے بیٹے تھے۔ ان کے ایک چھوٹے بھائی شیخ طالب علی بھی شاعر تھے اور مرزا فدوی کے شاگرد تھے۔ ان کا تخلص طالب تھا۔ بعض تذکروں میں ان کا ترجمہ موجود ہے۔ عین جوانی میں ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء میں غالباً دلی میں ان کا انتقال ہوا۔ راسخ کی پیدائش عظیم آباد میں ہوئی۔ ہرچند شاہ محمد مہدی نے اپنے مضمون مطبوعہ 'الپنچ' پٹنہ ۱۹۰۲ء اور سید ضمیر الدین نے 'سوانح راسخ' (مرقومہ ۱۹۰۲ء بزبان انگریزی) میں لکھ دیا کہ ان کی پیدائش موضع 'سائیں' (2) میں ہوئی تھی۔ (سائیں موجودہ پٹنہ شہر سے تقریباً پچیس کیلومیٹر دور دکھن پورب میں شرفا کا ایک پرانا گاؤں ہے) مذکورہ دونوں قلمکاروں نے اپنے دعویٰ میں کوئی مستند شہادت یا دستاویز نہیں دی ہے۔ اسی کو پڑھ کر محمد ممتاز عالم نے سائیں گاؤں جا کر پوچھ گچھ کی اور چند لوگوں کے کہنے کے مطابق بغیر کسی ثبوت کے راسخ کا شجرہ بھی مرتب کر دیا جو تحقیقی لحاظ سے ناقابل اعتبار ہے (3)۔ اس کے برخلاف جید قلم کار فصیح الدین بلخی اپنے مضمون 'راسخ عظیم آبادی' (مطبوعہ 'صنم' پٹنہ، جنوری۔ اپریل ۱۹۵۹ء) میں لکھتے ہیں کہ وہاں یعنی موضع سائیں کے باشندے راسخ کے حالات سے بالکل نابلد ہیں۔ راسخ کے دو ہمعصر اور ہم وطن محمد وجیہ الدین عشقی اور وزیر علی عبرتی نے بھی اپنے تذکروں میں انہیں عظیم آبادی کے سوا کچھ نہیں لکھا ہے، اس لیے وہی قابل ترجیح ہے۔

جائے پیدائش کی طرح ان کے سال پیدائش کے سلسلے میں بھی ادیبوں کے درمیان اختلاف رائے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء (4) قاضی عبدالودود نے ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء کے لگ بھگ (5) اور جمیل جالبی نے ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء (6) لکھا ہے مگر ان بیانات کا کوئی مصدقہ حوالہ نہیں ہے۔ سب قیاسات، تخمینے اور سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ اس لیے وثوق سے سال ولادت کا تعین مشکل ہے۔ اتنا کہنا مناسب ہے کہ وہ ۱۱۶۲ھ اور ۱۱۷۱ھ (۱۷۴۸ء اور ۱۷۵۷ء) کے درمیان پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ رواج کے مطابق ان کا مکتب ہوا ہوگا۔ ان کے اردو

اور فارسی کلام اور مکتوبات سے منکشف ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی معتمد اتالیق اور برگزیدہ عالم کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی سبب وہ مروجہ عصری علوم یعنی اردو، فارسی، عروض و بلاغت اور فن شاعری میں مہارت کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب پر بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ تصوف، الٰہیات اور فلسفہ سے بھی شغف تھا۔ وہ عظیم آباد کے خوشگوار ادبی ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ قدرت نے انہیں فطری طور پر موزونی طبع عطا کی تھی۔ بچپن سے شعر گوئی کا چسکا لگ گیا تھا۔ ابتدائی کلام پر انہوں نے مرزا محمد علی فدوی سے اصلاح لی۔ اپنی خداداد شعری سوجھ بوجھ، محنت اور لگن سے کلام میں ایسی پختگی، تازگی اور شگفتگی پیدا کی تھی کہ نوجوانی ہی میں ہمعصروں کے درمیان ان کی ایک الگ پہچان بن گئی تھی۔ ابوالحسن امر اللہ الہ آبادی (مؤلف تذکرہ 'مسرت افزا') نے اپنے قیام عظیم آباد (۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء) کے دوران راسخ کو ایک ہونہار نوجوان کی حیثیت سے دیکھا تھا اور ان کی شخصی خوبیوں اور شعری محاسن سے متاثر ہوئے تھے (7)۔ محمد وجیہہ الدین عشقی (مؤلف تذکرہ عشقی) نے بھی انہیں خوش ذہن و خوش فکر جوان شاعر لکھا ہے (8)۔ اس کے برعکس شاد عظیم آبادی کے استاد سید شاہ الفت حسین فریاد نے ان کا بڑھاپا دیکھا تھا۔ اپنے استاد کے حوالے سے شاد عظیم آبادی نے راسخ کے قد، رنگ، لباس اور مشاعروں میں شرکت کی تفصیل لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سفر غازی پور، لکھنو اور کلکتہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ عظیم آباد کے ایک شاعر خواجہ محمد شاہ شہرت نے بھی راسخ کی ضعیفی دیکھی تھی۔ امداد امام اثر نے ان سے کچھ واقفیت حاصل کی اور اپنی کتاب 'کاشف الحقائق' میں درج کی ہے۔

مذکورہ بالا اہل علم کی تحریروں سے مزید پتہ چلتا ہے کہ راسخ کا قد میانہ اور رنگ سانولا تھا۔ جوانی میں بہت دبلے پتلے اور لاغر تھے۔ بات چیت میں شوخی اور ملنے جلنے میں انکساری تھی۔ ہنس مکھ، مہذب، متین اور دوست نواز تھے۔ بزرگوں اور مہمانوں کی قدر افزائی اور خدمت کرنے میں آگے آگے رہتے تھے (9)۔ ان کے ازدواج اور اولاد کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں ملتی ہے۔ دو ایک قلمکاروں کو احتمال ہے کہ وہ مجرد ہی رہے۔ جہاں تک رہن سہن کا تعلق ہے جوانی کا لباس اور وضع قطع کا پتا نہیں چلتا ہے۔ بڑھاپے میں وہ عام طور پر گھر میں اس دور کے شرفاء کے روایتی لباس استعمال کرتے تھے۔ کبھی صندلی اور کبھی لال کرتا پہنتے تھے۔ سر پر کامدار ٹوپی ہوتی جو ایک طرف جھکی ہوئی ہوتی تھی۔ ان کی طبیعت میں ایک طرح کی بے نیازی اور سیمابیت تھی۔ وہ عظیم آباد کے کسی خاص محلے یا مکان میں نہیں رہے۔ کرایے کے

مکان میں رہتے اور اکثر بدلتے رہتے تھے۔ کبھی چوک پر، کبھی دیوان محلے میں اور کبھی صدر گلی میں مقیم رہے۔ غالباً اسی بنا پر محمد مسلم عظیم آبادی لکھتے ہیں__ ''وہ ایک فقیر تھا، نہ صرف وضع قطع، لباس اور طرز معاشرت کے لحاظ سے بلکہ سیرت وخصلت کے اعتبار سے بھی'' (10)۔ سیمابی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں نفاست اور لطافت بھی تھی۔ سننے کی حد تک موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ سروں کی آواز سے ان کا موڈ بنتا تھا۔ صوفی منش اور صاف طینت والے آدمی تھے۔ خانقاہوں اور درگاہوں میں بیٹھ کر اپنا صوفیانہ کلام بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اکثر شاہ باقرؒ کے تکیہ پر قیام رکھتے تھے (11)۔ وضع داری کے ساتھ وہ بڑی بے فکری کی زندگی گزارتے رہے۔ اہل ثروت سے کم ملتے تھے (12) مگر موقع ومحل کے اعتبار سے ان کی تعریف وتوصیف پر بھی مجبور ہوئے تھے۔ مقامی سطح پر ملازمت کرنا غالباً کسر شان سمجھتے تھے۔ خاندانی سرمایہ کب تک کام آتا۔ مالی بدحالی کی بنا پر ناقدری اور بدخواہوں کی مخالفتوں کا سامنا کرنے لگے۔ ان کلفتوں سے بیزار ہو کر انہوں نے دلّی جانے کے ارادے سے رخت سفر باندھا تاہم جب غازی پور پہنچے تو وہاں کے ادب نواز، جوہر شناس اور دولت مند لوگوں نے ان کی اتنی قدر ومنزلت کی کہ وہ تین سال تک وہاں مقیم رہے۔ شاعروں کی تربیت کی اور ادبی ماحول سازی میں حصہ لیا۔ اس کے بعد واپس عظیم آباد آ گئے۔ پٹنہ میں مہاراجا کلیان سنگھ شعر وسخن کے شیدائی اور سخن شخص تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور عاشقؔ تخلص کرتے تھے نیز شاعروں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ انہوں نے راسخؔ کی اعانت کی مگر مخالفین نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی حرکتوں سے بیزار اور بددل ہو کر انہوں نے 'مثنوی دربیان انقلاب زمانہ وشکایت فلک' لکھی جس میں مقامی لوگوں کے سفلہ پن اور حسد وبغض کا بیان بڑی افسردگی کے ساتھ کیا ہے:۔

یہ پٹنہ عجب دلکشا شہر تھا — طلسمات تھا واہ کیا شہر تھا
تھے صدق و صفا ہمیشہ اس کے مقیم — طریقِ وفا پر بہت مستقیم
فریبی، منافق، ریائی نہ تھی — کہ اہل وفا تھے، دغائی نہ تھے
بہت نیتیں نیک رکھتے تھے سب — زبان اور دل ایک رکھتے تھے سب
اب اس شہر کا طور ہی اور ہے — مقیموں کا اس کے بُرا طور ہے
ہوا نیتوں میں بڑا ہی فساد — کجی طبع میں آئی حد سے زیاد
ہیں از بس کہ سرگرم اعمال بد — ہمہ کین ہیں بالکل ہیں بغض و حسد

کوئی ان میں غماز و نمام ہے — کسی کا سخن چینی ہی کام ہے
لڑ دینے کا ہے مہیا کوئی — کھڑا دیکھتا ہے تماشا کوئی

راسخؔ نے عظیم آباد کی شان وشکوہ بھی دیکھی تھی۔ وہاں کے مشاعروں اور ادبی محفلوں سے نہ صرف مستفیض ہوئے تھے بلکہ ان کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ دہلی پر احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور مرہٹوں کی یورشوں سے سارے پرانے ادبی اور تہذیبی مراکز متاثر ہونے لگے تھے۔ عظیم آباد میں بھی افتراتفری کی شروعات ہو گئی تھی۔ سماجی، تہذیبی اور اخلاقی قدریں زوال پذیر ہونے لگی تھیں۔ راسخؔ اسی کا شکار ہو رہے تھے۔ آخر عاجز ہو کر وہ دوبارہ آمادۂ سفر ہوئے۔ انہیں دہلی جانے اور وہاں کے شاعروں سے ملنے کا اشتیاق تھا مگر اس اثنا میں جان ومال کے تحفظ کی خاطر لوگ دہلی سے بھاگ کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو رہے تھے۔ دوسری طرف نوابوں کی سخاوت اور علم دوستی کی وجہ سے فیض آباد اور لکھنو جیسے شہر کی رونق بڑھ رہی تھی۔ وہاں اہل فن بالخصوص شاعروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ لہٰذا دہلی کے اکثر فنکار، تخلیق کار اور شرفا اودھ کا رخ کرنے لگے تھے۔ میر ضاحکؔ، میر حسنؔ، سوداؔ، میرؔ، سوزؔ اور مصحفیؔ وغیرہ وہاں پہنچ چکے تھے۔ لکھنو میں نواب آصف الدولہ کا عہد حکومت (۱۷۹۷ء۔۱۷۷۵ء) اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ آصف الدولہ نے بڑے بڑے دہلوی شاعروں کی بہت فراخدلی اور فیاضی سے سرپرستی کی۔ میرؔ اسی دور میں ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء سے وہاں براجمان تھے۔ ان حالات میں راسخؔ نے دہلی جانے کا ارادہ ترک کیا اور ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء کے لگ بھگ وہ لکھنو پہنچے۔ دوسرے شاعروں کی طرح انہیں بھی دربار میں داخلہ مل گیا۔ انہوں نے نواب آصف الدولہ کی شان میں قصیدہ بھی لکھا اور وہاں کے قیام کے دوران میرؔ سے بھی قربت بڑھائی۔ ان ہی ایام میں راسخؔ کے استاد فدویؔ کا عظیم آباد میں فوت ہوا تھا لہٰذا انہوں نے میرؔ کی باضابطہ شاگردی اختیار کر لی۔ قیام لکھنو کے دوران انہوں نے مثنوی 'کشش عشق' لکھی جس میں ایک طویل قصیدہ نواب آصف الدولہ کی مدح میں ہے۔ وہاں وہ سات سال تک مقیم رہے پھر بقول شاد عظیم آبادی دلّی چلے گئے اور وہاں بھی دو چار سال رہے لیکن پریشان حالی میں کوئی کمی نہیں آئی (13)۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر ممتاز احمد کا خیال ہے کہ وہ دلی گئے ہی نہیں تھے (14) حالانکہ مخطوطہ انتخاب دیوان راسخ، مملوکہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد کے ترقیمہ سے دہلی جانے کا شبہ ہوتا ہے۔ بہرحال وہ دہلی گئے ہوں یا نہیں، ان کے بنارس جانے کے شواہد کلام میں موجود ہیں (15)۔ ہوسکتا ہے کہ لکھنو جاتے ہوئے بنارس

میں کچھ عرصے ٹھہرے ہوں۔ وہ دو بار لکھنو گئے تھے۔ دوسری بار نواب غازی الدین حیدر کے زمانے میں وہاں پہنچے تھے مگر ان کے لئے حالات حسب خواہ نہ ہو سکے تو عظیم آباد لوٹ آئے۔ اس کے بعد جلد ہی مونگیر، بھاگلپور اور مرشد آباد میں قیام کرتے ہوئے کلکتہ میں وارد ہوئے (16)۔ ان کے کلام سے لکھنو جانا دو مرتبہ ظاہر ہوتا ہے لیکن کلکتہ اور بنارس کتنی مرتبہ گئے، نہیں کہا جا سکتا۔'' (17) وہ اپنی تنگ دستی کے سبب مختلف شہروں میں قسمت آزمائی کرتے رہے پھر بھی مقصد میں کامیابی نہیں ملی۔

اپنی مثنویوں میں راسخ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ کلکتہ میں انہیں قدرے سکون ملا۔ اس دور میں کلکتہ ہندوستان کی عملی راجدھانی بن کر اہل علم وفن سے جگمگا رہا تھا۔ وہ وہاں کے ایک متمول شخص مولوی محمد راشد مفتی کے مہمان ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ قاضی سراج الدین علی خاں، منشی امین الدین احمد اور قاضی نجم الدین علی خاں وغیرہ نے ان کی بڑی عزت افزائی کی۔ مقامی شاعروں کے ساتھ وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں سے بھی راہ و رسم بنائی۔ کئی بزم طرب سے لطف اندوز ہوئے۔ ایک ایسی ہی بزم میں خوبصورت رقاصہ نواب جان کی طرف ان کا جھکاؤ ہوا تھا مگر غالباً جلد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک مشاعرے میں مسافر تخلص والے کسی معمولی شاعر نے اپنے کلام کے ذریعے وہاں موجود بعض شاعروں کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی تو انہوں نے ہجو لکھ کر اس کا فوری جواب دیا۔ اس نوک جھونک کے علاوہ کلکتہ میں ان کے ایک کرم فرما راجا جگر ناتھ پرشاد راسخ سے بہت ناراض ہو گئے تھے۔ وہ رقم کے لین دین کے کسی معاملے میں اتنا برہم ہوئے تھے کہ کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھے اور راسخ کو قید میں ڈالنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اکابر شہر سے سفارش بھی کروائی اور اپنی مثنوی 'مرات الجمال' بھی راجا کی نذر کی۔ اس کے بعد معاملہ طے ہوا یا نہیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہاں انہوں نے آصف الدولہ کی شان میں لکھی ہوئی اپنی مثنوی 'کشش عشق' کا ترمیم شدہ نمونہ نیز دوسری مثنوی 'حسن وعشق' کو ردوبدل کے ساتھ 'معدن فصاحت' کے نام سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو پیش کیا لیکن غالباً کوئی بات نہیں بنی۔

قیام کلکتہ کے دوران راسخ ادبی سطح پر کافی متحرک رہے۔ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۶ء کے لگ بھگ انہوں نے ایک خط مرزا جان طپش دہلوی کو لکھا تھا جس میں تصوف کے چند نکتوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔'' قاضی محمد سعید کی رائے میں یہ خط کلکتہ کے قیام کے دوران لکھا گیا تھا۔'' (18) اس کے علاوہ راسخ کے چند ایسے قطعات بھی ملتے ہیں جن سے تاریخ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۸ء نکلتی ہے اور اس وقت وہ غالباً کلکتہ میں ہوں گے

(19)۔ انہوں نے اپنے کلام میں کلکتہ کے سرکردہ لوگوں مثلاً میر شیر علی افسوس، مرزا کاظم علی جوان، مظہر علی خاں ولا، مولوی اللہ داد، مہدی علی خاں، ولیم ہنٹر، لمسڈن اور بٹلر وغیرہ کا ذکر کیا ہے یا ان کی تعریف میں شعر کہے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلکتہ میں اپنا حلقہ بڑھانے کے جتن کئے تھے۔ وہ وہاں سے کب واپس ہوئے، اس کا تعین ممکن نہیں ہے۔ کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے، حمید عظیم آبادی کا بیان درست ہو کہ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں عظیم آباد لوٹ آئے اور اس کے بعد کہیں نہیں گئے (20)۔

راسخ مشاعروں میں کب سے شریک ہو رہے تھے، اس کا پتا نہیں چلتا ہے مگر اتنا مسلم ہے کہ جوانی میں عظیم آباد کے مشاعروں اور شعری نشستوں میں ان کی ایک پہچان بن گئی تھی، اس کا اشارہ امر اللہ الہ آبادی کے اس بیان سے ملتا ہے:۔

''خدا کی مہربانی اور استاد کی توجہ کے فیض سے ان (راسخ) کے شعر اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ سننے والوں کے دلوں پر اثر کرتے ہیں۔'' (21)

اس ستائشی بیان سے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ راسخ لحن میں شعر پڑھتے تھے جس سے سننے والوں پر کچھ زیادہ اثر ہوتا ہوگا۔ شاد عظیم آبادی نے اپنے استاد سید شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی کے حوالے سے ان کے اس شخصی رکھ رکھاؤ اور برتاؤ پر روشنی ڈالی ہے جو خاص طور پر مشاعروں میں نظر آتا تھا۔ ان کا درج ذیل بیان بہت اہم ہے:۔

''استاد مرحوم (سید شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی) نے ان کو دو ایک مشاعرہ میں ملاحظہ کیا تھا۔ وہاں کی سج دھج دوسری تھی۔ اگرئی رنگ کی پگڑی کرتے پر بڑی بڑی آستینوں کی قبا پہنے ہوئے مودب دو زانو بیٹھے رہا کرتے۔ مشاعرہ شروع ہوتا تو آنکھیں بند کر کے جھوما کرتے تھے۔ جب تک صحبت ختم نہ ہو لیتی، کسی کی تعریف نہیں کرتے تھے یا اس کو خلاف ادب سمجھتے تھے یا شعروں کا لطف اس وقت تعریف کرنے ہی نہ دیتا ہوگا۔ جب مشاعرہ ختم ہو لیتا تھا تو بہ حسب مراتب کسی کی شان میں ماشاءاللہ، کسی تعریف میں سبحان اللہ اور جس سے ذری زیادہ خوش ہوئے تو انہیں الفاظ کو مکرر اعادہ فرماتے تھے۔ اپنی غزل پڑھتے وقت آنکھوں سے آنسو ٹپکتے جاتے تھے اور

بہت ہی آہستہ سے رومال اٹھا کر پونچھ لیا کرتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ بڑی غزلوں میں سے چار ہی شعر پر مشاعرہ کا خاتمہ کر دیا۔ نواب مہدی علی خاں مرحوم والے مشاعرے میں خلاف طرح غزل پڑھی اور اس شعر کو لوگوں نے دس مرتبہ پڑھوایا:

نہیں ہوش والوں سے کچھ حسد، مجھے رشک ہے تو انہوں پہ ہے
جنہیں تیرے جلوہ کے سامنے، میری طرح بے خبری رہی

آخر گھبرا کر فرمایا کہ بھئی کس قدر۔ اب تو میری آواز بھی نہیں نکلتی۔'' (22)

درج بالا تفصیل سے آشکار ہوتا ہے کہ راسخ ایک روایت پرست شاعر تھے۔ وہ نظم وضبط اور تہذیب کے علمبردار تھے۔ ان کے شعر پڑھنے کا ایک دلکش انداز تھا۔ جس سے سامعین متاثر ہوتے تھے۔ کیوں کہ شعر کتنے ہی اعلیٰ درجے کے کیوں نہ ہوں جب تک مشاعرے میں پڑھنے اور پیش کرنے حسن نہ ہو، اس کے معنی نہیں کھلتے ہیں۔ فقیرانہ مزاج ہونے کے باوجود وہ آداب مشاعرہ کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے۔ اپنے پہناوے سے بھی مشاعروں کی انفرادی شان کا اظہار کرتے تھے۔

عظیم آباد کے علاوہ کلکتہ کے مشاعرے اور بزم طرب میں راسخ نے شرکت کی تھی اور اپنی جگہ بنائی تھی۔ ایک مشاعرے میں مجہول الاسم شاعر مسافر نے وہاں موجود شاعروں کا مذاق اڑایا تھا۔ قاضی عبدالودود کے مطابق ''مسافر نے امین اللہ و (مرزا جان) طپش کی صراحتہً اور بعض دوسرے شرکائے مشاعرہ کی کنایتہً ہجو کی تھی۔'' (23) راسخ اس سے بہت جز بز ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی برہمی کا اظہار اس طرح کیا کہ مسافر کے شعر پر فی البدیہہ ہجو یہ انداز کی ایک مخمس کہہ دی۔ اس کے دو بند یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

اے تنگِ رتبۂ جہلائے مشاعرہ　　تو ہووے روکش فضلائے مشاعرہ
تو اور یوں کہے ہے بجائے مشاعرہ　　دیدیم مجمع کبر ائے مشاعرہ
کم نیست از مکابرہ جائے مشاعرہ
انسانیت سے بہرہ تجھے حیف کچھ نہیں　　وہ شخص ہے جو فاضل و ہم شاعر متیں
کہتا ہے اس کے حق میں تو اسے حاسدِ لعیں　　آں بودم دیں کہ شد متخلص بہ بوالمدیں

چوں زاغ می پرد بہ ہوائے مشاعرہ

اس مخمس سے پانسہ پلٹ گیا اور مسافر خود مذاق کا نشانہ بن گیا۔ دراصل راسخ مشاعرے کی تہذیب، آداب اور اصول وضوابط کے سخت پابند تھے۔ اس واقعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ مشاعرے کے شرکاء کے ساتھ کسی طرح کی بدتمیزی برداشت نہیں کرتے تھے اور اس کا فوری ردعمل ظاہر کر دیتے تھے۔ یہ واقعہ ان کی ذہانت، قادرالکلامی اور نستعلیق شخصیت کی گرہیں بھی کھولتا ہے۔

تلاش معاش میں راسخ اپنے شہر عظیم آباد سے باہر نکلنے پر مجبور ہوئے تھے اور کئی شہروں۔ غازی پور، بنارس، لکھنو، مونگیر، بھاگلپور، مرشدآباد اور کلکتہ میں طویل یا مختصر مدت تک قیام پذیر ہوئے تھے مگر تذکروں یا دوسری تحریروں سے پتا نہیں چلتا ہے کہ انہوں نے عظیم آباد اور کلکتہ کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں مشاعرے یا بزم شعروسخن میں شرکت کی تھی۔

اردو میں معاصر شعرا کے مابین ادبی نوک جھونک کی ایک روایت رہی ہے۔ شاد عظیم آبادی کے مطابق مرزا دانش سے راسخ کی معاصرانہ چشمک تھی:۔

''مرزا دانش علی دانش کوچۂ صدر کے رہنے والے تھے اور بعض حضرات ان کو غلام علی راسخ پر ترجیح دیتے تھے۔ راسخ ان کو بے دانش کہتے تھے۔ دانش، راسخ کو فاسق کہتے تھے۔ آپس میں خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی''۔ (24)

راسخ کی زندگی میں عشق و عاشقی کے معمولی واقعات ملتے ہیں، جس کا علم ان کی مثنوی 'گنجینۂ عشق' سے ہوتا ہے۔ یہ مثنوی ان کے قیام عظیم آباد میں تصنیف ہوئی اور غالباً جوانی کی یادگار ہے۔ اس میں انہوں نے کھل کر اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف ہی نہیں کی ہے، اعتراف عشق بھی کیا ہے اور اپنے محبوب کا نام بھی لیا ہے۔ اس مثنوی کے متعلقہ تین شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

بہت اس شہر میں ہیں خوبرو پر　　نہیں ہے دلبر اپنا کوئی دلبر
دل اپنا اس صنم کا فقط ہے رام　　کہ 'شرفو' جس کا ہے نام خدا نام
اسی گل کی ہوا ہے دل میں اپنے　　یہی آتش ہے آب و گل میں اپنے

ان اشعار سے منکشف ہوتا ہے کہ وہ 'شرفو' پر فریفتہ ہوئے تھے اور غالباً یہ ان کا پہلا عشق تھا۔ اس کے علاوہ کلکتہ میں ایک رقاصہ نواب جان کی طرف راغب ہونے کا ذکر ملتا ہے مگر ان ہلکے پھلکے واقعات

سے ان کی شخصیت مجروح نہیں ہوتی ہے۔صوفیت کی ڈور انہیں ایک مرکز پر کھینچے رہی۔اکثر قلمکاروں نے ان کی صوفیانہ اور قلندرانہ زندگی کو اجاگر کیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ انہیں خانقاہوں اور بزرگوں سے بڑی عقیدت ومحبت تھی اور ولیوں کے روحانی فیض پر یقین رکھتے تھے۔غالباً یہی سبب ہے کہ انہوں نے بڑی خانقاہ، پھلواری شریف (پٹنہ) کے ہمعصر بزرگ حضرت شاہ ابوالحسن فرؔد کو اپنا پیرو مرشد تسلیم کیا۔انہیں اہل بیت اور صحابہ کرام کی عظمتوں کا بھی اعتراف تھا۔کئی مثنویوں میں حضورؐ کے نعتیہ قصیدے کے بعد حضرت علیؓ کی منقبت لکھی ہے۔مثنوی 'نور الانظار' کے یہ اشعار دیکھے جاسکتے ہیں:۔

اکمل و اشرف و افضل ہے وہ   ذات کا مظہر اول ہے وہ
ہستی اس کی سبب نظمِ کُل   زہے وہ قافلہ سالارِ رُسُل
لغت ایسے کی کہاں ہو مجھ سے   وصف اس کا نہ بیاں ہو مجھ سے
آل کی اس کے ہے کیا قدر رفیع   دوستی ان کی ہے میری توشیع

اسی کے ساتھ وہ مثنوی 'اعجاز عشق' میں چاروں خلفائے راشدین کے انفرادی اوصاف بھی بیان کرتے ہیں:۔

اسؐ کے اصحاب جملہ مہر و وفا   صاحب علمؓ و صدقؓ و عدلؓ و حیاؓ

بہر حال راسخؔ نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال (۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء سے ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء تک) عظیم آباد میں گزارے۔ان کا انتقال سوموار کے دن ۲۰/ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء کو ہوا اور عظیم آباد ہی میں مدفون ہوئے۔ان کے ایک شاگرد انور علی یاسؔ آروی کے مطبوعہ دیوان میں راسخؔ کی وفات پر تین قطعات درج ہیں۔ان میں سے ایک قطعہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

بہ جنت رفت از دنیا چوں راسخؔ   بہ فن شعر ملجا و ملازم
نمودم فکر تاریخ وفاتش   دل من گفت ''ہے ہے اوستادم''(25)

۱۲۳۸ھ

ان کا پختہ مزار عظیم آباد (حالیہ پٹنہ صاحب یا سیٹی) کے محلّہ لودی کٹرا، رضا لین کی دکھن جانب کے قبرستان میں اب بھی موجود ہے۔

حوالے وحواشی

(1) بحوالہ دیوان راسخؔ عظیم آبادی، ص:۳۶۔۳۵، مرتبہ: ڈاکٹر شکیب ایاز، مطبوعہ نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

(2) (الف) بحوالہ راسخ، ص:۱۷، مولفہ: حمید عظیم آبادی مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۰ء

(ب) خم خانہ جاوید (جلد سوم) ص:۳۲۶ مولفہ: لالہ سری رام مطبوعہ دہلی، ۱۹۱۷ء

(ج) بحوالہ دیوان راسخ عظیم آبادی (حالات) ص:۳۵ مرتبہ: شکیب ایاز

(3) راسخ شخصیت اور فن، ص:۱۹ مصنفہ: محمد ممتاز عالم، مطبوعہ پٹنہ، ۲۰۰۰ء

(4) نوائے وطن، ص:۸۷ مصنفہ: شادؔ عظیم آبادی، مطبوعہ پٹنہ ۱۸۸۴ء

(5) نوائے ادب (ششماہی) بمبئی، اپریل ۱۹۵۶ء

(6) تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ص:۸۰۷ مصنفہ: جمیل جالبی، دہلی، ۲۰۱۹ء

(7) تذکرہ مسرت افزا، ص:۱۰۸ مؤلفہ امراللہ الہ آبادی مترجمہ: مجیب قریشی مطبوعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء

(8) تذکرہ عشقی، ص:۶۷ مترجمہ: عطا کاکوی مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۴۹ء

(9) تذکرہ مسرت افزا، ص:۱۰۸

(10) بحوالہ مثنویات راسخؔ، ص:۷۰

(11) بحوالہ مثنویات راسخ، ص:۵۸ مصنفہ: ممتاز احمد مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۵۷ء

(12) ایضاً ص:۵۸

(13) نوائے وطن، ص:۸۷

(14) مثنویات راسخ، ص:۸۹، پٹنہ، ۱۹۵۷ء

(15) کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، ص:۴۵۱ مرتبہ نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۵۷ء

(16) نوائے وطن، ص:۸۷

(17) مثنویات راسخ،ص:۸۹

(18) بحوالہ دیوان راسخ عظیم آبادی (حالات) ص:۴۳ مرتبہ:شکیب ایاز

(19) مثنویات راسخ،ص:۸۸

(20) راسخ عظیم آبادی،ص:۳۰ (’نوائے وطن‘ مصنفہ شاد عظیم آبادی میں درج ہے کہ ’’۱۲۲۲ھ میں وطن مالوف میں تشریف لائے ۔ پچاس برس کی عمر ہو چکی تھی.....‘‘ ۔’’۱۲۳۸ ہجری میں چھہتر برس کی عمر پا کر سفر آخرت اختیار کیا‘‘ ص:۸۹، یہ بیان عجلت میں رقم ہوا ہے یا کتابت کی غلطی راہ پا گئی ہے۔ پیدائش کے سن ۱۱۶۲ھ کے حساب سے ۱۲۲۲ھ میں راسخ عمر ساٹھ سال ہوگی نہ کہ پچاس سال۔ اگر وہ ۱۲۲۲ھ میں پچاس کے تھے تو ۱۲۳۸ھ میں چھہتر (۷۶) سال کے کیسے ہو جائیں گے۔ر۔ا۔)

(21) تذکرہ مسرت افزا،ص:۱۰۸ مترجمہ: ڈاکٹر مجیب قریشی،دہلی ۱۹۶۸ء

(22) نوائے وطن،ص:۸۰،۷۹

(23) بحوالہ دیوان راسخ عظیم آبادی،ص:۴۹ مرتبہ: ڈاکٹر شکیب ایاز (24) ’حیات فریاد‘،ص:۲،۷۲، شاد عظیم آبادی مطبوعہ اعظم گڑھ،۱۹۲۷ء

(25) مثنویات راسخ،ص:۹۵

❀

تصنیف وتالیف

(۱) کلیات ردیوان (اردو)

(۲) فارسی کی چند غزلیں،اشعار،قطعات وغیرہ ان کے کلیات ردیوان اردو میں شامل ہیں۔

(۳) مکتوبات فارسی و اردو: راسخ نے اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ ابوالحسن فرد کو ۱۲۳۰ھ میں جو خط فارسی میں لکھا تھا وہ ’کتب خانہ‘ خانقاہ پھلواری شریف، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ دوسری خط وزیر علی عبرتی کے نام ہے اور ان کی کتاب ’ریاض الافکار‘ میں چھپا ہوا ہے۔ راسخ نے ۱۲۲۰ھ کے لگ بھگ اردو و فارسی کا ملا جلا ایک خط بنام مرزا جان طپش لکھا تھا۔ غالباً وہ اس دوران کلکتہ میں تھے۔ وہ خط قاضی عبدالودود کی ملکیت والے نسخۂ کلیات راسخ میں شامل ہے۔(1)

(۴) رسالہ درفن عروض مسماۃ بہ خلاصۃ الخلاصہ: اس کا ایک خطی نسخہ ڈاکٹر ممتاز احمد کی نظر سے گذرا تھا۔ اس کی کتابت ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں بیجک لعل نے کی تھی۔ ساڑھے تینتیس صفحوں کے رسالہ کا سائز ۲۲/۸×۲۶/۱انچ ہے۔ اس میں شاعری کے حوالے سے علم معانی، علم بدیع، بیان معنوی، معائب سخن، علم عروض، حقیقت قافیہ و ردیف اور رباعی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دیباچے کے مطابق راسخ نے یہ رسالہ ایک عزیز کی فرمائش پر لکھا تھا(2) مگر اب یہ دستیاب نہیں ہے۔

کلیات ردیوان اور مثنوی رواسوخت کے خطی نسخے

(الف) کلیات راسخ: اس کا ایک خطی نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ فہرست مخطوطات میں اسے ’دیوان راسخ‘ لکھا گیا ہے۔ اس میں کل پانچ سو اکاسی (۵۸۱) صفحات ہیں۔ اس کے ترقیمہ میں کاتب کا نام عبدالغفار درج ہے اور تاریخ تکمیل کتابت چار جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء

ہے۔اس کا مسطر سولہ سطری ہے اور سائز ۱۰.۵×۶.۵ انچ ہے۔خط نستعلیق میں لکھا ہوا یہ نسخہ صاف ستھرا ہے مگر اغلاط سے پاک نہیں ہے۔اس میں ذیلی عنوانات وغیرہ سرخ روشنائی سے لگائے گئے ہیں۔اس کی ابتدا نعت شریف سے ہوئی ہے۔اس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

اعتدال افسوس گردوں کی طبیعت میں نہیں — بس کہ ہے تغیر اس کو گہہ چناں گاہے چنیں

آخر میں 'مثنوی در حکایت در بیان تاجر' ہے اور مذکورہ مثنوی کے اس شعر پر کلیات کا خاتمہ ہوتا ہے:۔

اس کنارے سے پانی ہٹ جاوے — اُس کنارے رواں دواں آوے

کلیات میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے بصورت نعت و منقبت، شخصیاتی قصیدے، رباعیاں، مخمس، واسوخت، ہجو اور مرثیے درج ہیں یعنی راسخ نے جتنی اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی تھی، سب کے نمونے اس میں موجود ہیں۔ڈاکٹر شکیب ایاز کے مطابق ''اتنا جامع دوسرا کوئی نسخہ فی الوقت کلیات راسخ کا موجود نہیں ہے۔''(3)

(ب) دیوان راسخ: یہ دوسرا خطی نسخہ بھی مملوکہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں ہے۔اس میں دو سو چوبیس صفحات ہیں۔اس کا سائز ۱۲.۵×۱۰.۵ انچ ہے۔اس میں نہ کاتب کا نام درج ہے نہ سال کتابت مگر چند قطعات تاریخ درج ہیں جن سے سال تحریر ۱۲۱۹ھ تا ۱۲۲۴ھ نکلتا ہے۔اس میں متعینہ سطر نہیں ہے۔کلام کا اندراج آڑے ترچھے انداز سے حاشیے میں بھی ہوا ہے۔کئی جگہ قطع برید اور ترمیم و اضافہ ایک ہی طرز اور ایک ہی لکھاوٹ میں ہے۔نیز کئی جگہ 'باید نوشت' اور 'بناید نوشت' بھی لکھا ہوا ہے۔اس کیفیت سے گمان ہوتا ہے کہ کتابت شدہ نسخے میں خود راسخ نے تصحیح و اصلاح اور رد و بدل کیا ہے۔اسی بنا پر اس گنجلک اور خام مسودے کو 'بخط شاعر' بھی قرار دیا جاتا ہے۔

(ج) مذکورہ لائبریری میں راسخ کے تین اور خطی نسخے — دیوان راسخ (۸۷ ورق) مثنویات راسخ (۲۸ ورق) اور مثنوی نور الانظار (۹ ورق) بھی ہیں۔ان کے علاوہ ایک ایسے مجموعہ واسوخت کا بھی خطی نسخہ ہے جس میں کئی شاعروں کی واسوخت ہیں۔میرؔ اور سوداؔ کے ساتھ راسخ کی واسوخت اس میں شامل ہے۔

(د) دیوان راسخ: یہ خطی نسخہ قاضی عبدالودود مرحوم کی ملکیت میں تھا۔غالباً اس کی کتابت راسخ کی زندگی میں ہوئی تھی۔اس میں کاتب کا نام یا سال کتابت درج نہیں تھا۔غزلیں، مثنویاں اور دوسری صنفوں کے نمونے شامل تھے۔۱۹۵۷ء میں بقول ڈاکٹر ممتاز احمد اس کے چند اوراق ہی رہ گئے تھے۔(4)

(ہ) دیوان راسخ: یہ خطی نسخہ سید محمد حسنین مرحوم (سابق صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا، بہار) کی تحویل میں تھا۔اس کی کتابت گوبند لال نے ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں کی تھی۔اس میں کل چھ سو گیارہ (۶۱۱) صفحات تھے اور سائز ساڑھے دس انچ × سوا چھ انچ تھا۔اب اس نسخے کا بھی کہیں پتا نہیں چلتا ہے۔(5)

(و) دیوان راسخ: یہ خطی نسخہ ڈاکٹر شکیب ایاز مرحوم کی ملک تھا۔اس میں کاتب کا نام موجود نہیں ہے مگر سن کتابت ۱۲۶۷ھ درج ہے۔ ان کے مطابق اس کے بھی کچھ اوراق ضائع ہوگئے تھے۔(6) موصوف کی وفات کے بعد یہ نسخہ اب کہاں ہے، کہنا مشکل ہے۔

(ز) دیوان راسخ: نسخۂ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں پچھتر ورق ہیں اور اسکا سائز نو انچ ×سات انچ ہے۔مخطوطات کے رجسٹر میں اس کا شمار نمبر ۹۹۸ ہے۔یہ نسخہ خط نستعلیق میں ہے مگر اس کے کاتب کا نام یا سال کتابت درج نہیں ہے۔اس میں غزلوں وغیرہ کے علاوہ دو مثنویاں، سبیل نجات اور حسن و عشق بھی شامل ہیں۔اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک انتخاب کلام ہے۔

(ح) انتخاب دیوان راسخ: کتب خانہ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں یہ نسخہ محفوظ ہے۔اس کا سائز ساڑھے آٹھ انچ × پانچ انچ ہے اور صفحات کی کل تعداد چوالیس ہے۔خط نستعلیق کے اس نسخے میں مسطر متعین نہیں ہے۔اس میں مختلف ردیفوں کی غزلیں بغیر کسی ترتیب کے اکٹھا کر دی گئی ہیں۔ترقیمہ میں کاتب محمد علی قادری نے لکھا ہے:۔

''منتخب مجموعہ فصاحت و بلاغت شیخ غلام علی راسخ غفرلۂ در بلدہ شاہ جہاں آباد
.....در سنہ یک ہزار دو صد چہل وہشت (۱۲۴۸)، ماہ جمادی الآخر، از دست
احقر العباد محمد علی قادری عفی اللہ ذنوبہ و سر عیوبہ صوری تحریر یافت۔''(7)

کاتب کی اس تحریر سے وضاحتی فہرست کے مرتب نصیر الدین ہاشمی کو یہ مغالطہ ہوگیا کہ ''وہ (راسخ) دہلی کے متوطن تھے اور ۱۲۴۸ھ میں انتقال ہوا۔''(8)

مذکورہ ترقیمہ سے یہ شبہ ضرور ہوتا ہے کہ راسخ دلی گئے ہوں گے اور یہ انتخاب وہیں کیا ہوگا مگر فوری طور پر اس کی کتابت نہیں ہوسکی۔ان کے انتقال کے دس سال بعد محمد علی قادری نے کتابت مکمل کی۔

(ط) ڈاکٹر ممتاز احمد نے 'بیاض دیسنہ'، 'بیاض جیلان' اور ایک 'قلمی بیاض' (مملوکہ پروفیسر سید حسن مرحوم) کا بھی ذکر کیا ہے جن میں راسخ کا کلام ہے۔(9)

کلیات/دیوان، مثنوی اور واسوخت کے مطبوعہ نسخے

(۱) فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی راسخ کے ایک مطبوعہ دیوان اور مثنوی کے متعلق لکھتا ہے:

''دیوان جو لکھنو میں ۱۲۶۳ھ (۴۷-۱۸۴۶ء) میں آتش و آباد کے دواوین کے ساتھ دو سو چھپن صفحوں کی ایک جلد میں شائع ہوا۔ اس میں تین ستون ہیں اور ہر ستون ایک دیوان کے لئے مخصوص ہے۔

مثنوی 'ناز و نیاز' جس کا موضوع حمد و نعت ہے۔ یہ کتاب جو کہ اردو نظم میں ہے ،۱۸۵۱ء میں مطبع مصطفےٰ خاں، کانپور میں طبع ہوئی۔''(10)

(۲) دیوان راسخ مملوکہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے ملتے جلتے ایک نسخے کی اشاعت بطور 'کلیات راسخ' خیر المطابع، عظیم آباد سے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں ہوئی تھی۔ اس میں کل چار سو انٹھاون صفحات ہیں مگر اس میں کئی شمار نمبر ہیں۔ اولین اٹھائیس صفحوں میں نعت، منقبت، قصیدے اور قطعات مدحیہ درج ہیں۔ اس کے بعد نئے شمار نمبر کے ساتھ ایک سو سینتالیس صفحوں میں ردیف وار غزلیں ہیں۔ غزلوں کی ابتدا اس حمدیہ مطلع سے ہوتی ہے:۔

زہے جان آفریں جس نے جہان و جاں کیا پیدا　　کف خاک سیہ سے صورت انساں کیا پیدا

غزلوں کے سلسلے کا خاتمہ ردیف 'ے' کے اس مقطع پر ہوتا ہے:۔

کسو سے مجھ کو فن شعر میں دعویٰ نہیں راسخ　　کسو کو مجھ سے گر ہووے تو، یہ گوئے یہ میداں ہے

پھر مثنویاں، مخمس، واسوخت، رباعیاں، مرثیے، منظوم حکایتیں اور مناجات ہیں۔ ہر صنفی نمونے کے لیے الگ الگ شمار نمبر قائم کئے ہیں۔

(۳) 'دیوان راسخ' (بخط شاعر) مملوکہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کا عکس چھپ کر وہیں سے ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا تھا۔

(۴) کلیات راسخ، مملوکہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی تدوین و تصحیح ڈاکٹر شکیب ایاز نے کی۔ ایک جامع مقدمے کے ساتھ اس کی اشاعت لائبریری کی طرف سے ۲۰۰۶ء میں ہوئی۔ پانچ سو بائیس صفحات کی اس کتاب کی اشاعت خدا بخش لائبریری، پٹنہ کی طرف سے ہوئی ہے۔ یہ دراصل مذکورہ لائبریری کے سب سے ضخیم اور مکمل خطی نسخے پر محیط ہے۔ اس کا 'حرف آغاز' لائبریری کے ڈائرکٹر امتیاز احمد

نے لکھا ہے اور راسخ اور واسوخیات پر معلومات فراہم کی ہے۔ اس کے بعد مدون و مرتب ڈاکٹر شکیب ایاز نے نیچے دی ہوئی ترتیب سے تفصیلی مقدمہ، دیوان کا متن اور کتابیات شامل کئے ہیں:۔

۱۔دیوان راسخ سے متعلق چند باتیں	آٹھ صفحے
۲۔راسخ کے کلام پر ایک نظر (راسخ کی غزل گوئی)	آٹھ صفحے
۳۔راسخ تذکروں اور کتابوں میں	اٹھارہ صفحے
۴۔حالات	بیس صفحے
۵۔دیوان راسخ مع حواشی	صفحہ ۵۵ سے ۳۲۰ تک
۶۔کتابیات	دو صفحے (صفحہ ۳۲۱ سے ۳۲۲)

دیوان کی تدوین و ترتیب میں ڈاکٹر شکیب ایاز نے اپنے تحقیقی و تنقیدی شعور کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ بڑی محنت اور چھان بین سے قریب قریب سارے دستیاب مواد کی روشنی میں مقدمہ بھی لکھا ہے اور کلام کے متن کی تصحیح بھی کی ہے۔ انہوں نے 'کلیات راسخ' مطبوعہ خیر المطابع، عظیم آباد (پٹنہ صاحب/سیٹی)، ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس میں غزلیات، مثنویات، قصائد، مخمسات، رباعیات، قطعات، واسوخت اور مراثی ہیں۔ ڈاکٹر شکیب ایاز نے بڑی دقت نظر سے لائبریری والے نسخے کے متن کا ۱۳۱۱ھ میں چھپے ہوئے کلیات کے متین سے تقابل کیا اور اختلاف متن اور دوسری تفصیلات حاشیے میں درج کر دی ہیں۔

اس کے علاوہ مذکورہ دیوان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ راسخ کے جو اشعار ۱۳۱۱ھ والے مطبوعہ کلیات اور خدا بخش والے خطی نسخے میں نہیں ہیں مگر تذکروں میں ملتے ہیں، انہیں حوالے کے ساتھ 'ضمیمے' میں درج کر دیا گیا ہے۔

اس دیوان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غزلیات، قصائد، رباعیات، مخمسات، ہجو، واسوخت اور مراثی کو شامل کیا گیا ہے مگر خدا بخش والے خطی نسخے میں موجود مثنویوں کو اس جواز کے ساتھ شامل نہیں کیا ہے کہ ڈاکٹر ممتاز احمد کی کتاب 'مثنویات راسخ' (مطبوعہ ۱۹۵۷ء) میں سارے مثنویات درج ہیں۔

نسخے کے قدیم املا کو مدون/مرتب نے عموماً جدید بنا دیا ہے جس سے عام قاری کو پڑھنے میں دقت نہیں

ہوتی ہے۔تدوین وترتیب متن کے اصولوں کی پابندی پر خاص توجہ دی گئی ہے اور حاشیے وحوالہ جات بھی بڑے محنت سے لکھے گئے ہیں۔اسے تدوین متن کا ایک عمدہ اور وقیع نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۵) راسخ کی کئی مثنویاں علیحدہ مختلف شہروں اور پریس سے انیسویں صدی میں چھپی تھی۔بعض کتب خانوں میں ان کی کاپیاں موجود ہیں۔اس طرح واسوخت کے بھی مطبوعہ نسخے بہار کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

حواشی

(1) دیوان راسخ عظیم آبادی،ص:۳

(2) مثنویات راسخ،ص:۸۷۔۸۶

(3) دیوان راسخ عظیم آبادی،ص:۴۳

(4) مثنویات راسخ،ص:۱۲۷

(5) دیوان راسخ عظیم آبادی،ص:۳

(6) ایضاً ص:۳

(7) کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست،ص:۴۵۱۔۴۵۰

(8) ایضاً ص:۴۵۰

(9) مثنویات راسخ،ص:۱۲۸۔۱۲۷

(10) بحوالہ مثنویات راسخ،ص:۵۳

معاصرین اور تلامذہ

راسخ نے ایک ایسے دور میں آنکھ کھولی جب کلاسیکی اردو شاعری کی ایک مضبوط روایت بن چکی تھی۔ان کے نامور پیش رووں میں میر حسن، میر، سودا، درد اور سوز لفظوں اور تلازموں کی تراش خراش اور ترتیب وتزئین سے ایک نگارخانہ پیش کر چکے تھے۔جذبہ واحساس اور فکر وخیال کا ایک خوشگوار آہنگ بنا چکے تھے۔سریلے، رسیلے اور سبک دیسی لفظوں میں فارسی وعربی کے مستعمل الفاظ گھل مل کر ایک ایسا سحر انگیز شعری اسلوب وضع کر چکے تھے جس میں ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کا بہترین عکس تھا۔راسخ کے اہم معاصرین مرزا دانش علی دانش عظیم آبادی، کلیان سنگھ عاشق عظیم آبادی، جرأت، مصحفی، انشا، آتش، ناسخ، افسوس، ولا اور جوان وغیرہ اس روایت کی پاسداری کر رہے تھے یا الگ راہ نکالنے میں منہمک تھے۔خاص طور پر جرأت، انشا، آتش اور ناسخ نے لفظوں اور ترکیبوں کو ایک الگ معنیاتی رخ دینا شروع کیا تھا اور خارجیت کی نئی نئی جہتیں پیش کرنے میں مشغول تھے۔

راسخ روایت پرست اور راست گو شاعر تھے۔انہوں نے معاصرین کا کوئی خاص اثر نہیں لیا مگر اپنے استاد فدوی اور میر اور اہم پیش رو سودا اور درد کے فکری اور اسلوبیاتی میلان سے اپنی شاعری کو ہم آہنگ کیا۔انہوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت بھی اس نہج پر کی۔ان کے آٹھ تلامذہ تھے اور اکثر صاحب دیوان تھے۔راسخ کے پیش رووں اور معاصروں کے فکر وفن پر متنوع تحریروں کی کمی نہیں،اس لئے ذیل میں فرداً فرداً ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:۔

۱۔ **خواجہ محمد محسن عظیم آبادی (وفات:۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء)**: ان کی زندگی کے کوائف بہت کم ملتے ہیں۔اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ حضرت رکن الدین عشق کے داماد تھے اور پہلے مرزا فدوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں فدوی کے انتقال کے بعد وہ راسخ کے حلقۂ تلامذہ سے شامل ہوئے۔اپنے صوفیانہ

مزاج کی بناپر وہ راسخ کی سخن آرائی کے بڑے معترف تھے۔کئی شعروں میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ان کے دو قلمی دیوان موجود ہیں۔ان کے دو شعر بطور نمونہ درج ہیں:۔

چشم تحقیق سے جس سمت نظر کی ہم نے
مثل خورشید تھے یار درخشاں دیکھا
ہے خودی حرفِ غلط، اس کا اٹھایا چاہیئے
صفحہ خاطر سے نقش اس کا مٹایا چاہیئے

۲۔ **خواجہ فیض اللہ فرحتؔ عظیم آبادی (وفات: ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء)**: وہ شاہ غلام مخدوم کی عرفیت سے مشہور تھے۔ان کے حالات زندگی کے متعلق کوئی خاص مواد دستیاب نہیں ہے۔وہ عملاً صوفی تھے اور سلسلۂ ابوالعلائیہ سے وابستہ تھے۔اردو اور فارسی ہر دو زبان میں شاعری کرتے تھے۔نیشنل لائبریری کلکتہ میں ان کے دیوان کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ان کے دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

جب کوئی منظور نظر ہوگیا — دیدہ و دل اپنا اُدھر ہوگیا
ہے دل کی تپش سینہ میں جوں طائر بسمل — اب نیند کسے کہتے ہیں، آرام کہاں ہے

۳۔ **حکیم احمد حسین حکیمؔ عظیم آبادی**:۔وہ لکھی سوداگر کے نام سے مشہور تھے۔شیخ فیض بخش کے بیٹے تھے۔شعر وشاعری سے شغف تھا۔ان کے یہ شعر تذکروں میں ملتے ہیں:۔

کچھ آج الجھتی ہے ہوا سے مری زنجیر
کیا آئی ہوا کاکل پیچاں سے الجھ کر
آنکھیں تری وہ ترک ہیں کافر کہ جنھوں نے
دیں چھین لیا گیر و مسلماں سے الجھ کر

۴۔ **مرزا مراد بخش عرف مرزا احمد مرادؔ**: ان کے والد کا نام ناصر محمد خاں تھا۔میر جعفر خاں صوبہ دار بنگالہ کی زوجہ منی بیگم کے وکیل تھے۔اس لئے مراد کا قیام عموماً مرشد آباد اور کلکتہ میں رہتا تھا۔۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں جوانی میں ان کا انتقال ہوا۔دو شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

جاں بہ لب ہوں میں خماروں سے اور آتی ہے بہار
وقت ہے ساقی اگر جام میں صہبا کیجئے

ہے عشق و عقل سے ہر دم مجادلہ دل کا
کشاکشی میں پڑا ہے معاملہ دل کا

۵۔ **حکیم ابوالحسن محزوںؔ عظیم آبادی (وفات: ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء)**: مشہور اور ماہر طبیب تھے۔اچھی شاعری کرتے تھے۔ان کے دو شعر نقل ہیں:۔

آسماں اپنا اٹھالے یاں سے ورنہ عندلیب
خندہ گل ایک دن برق چمن ہوجائے گا
ہم جو چاہیں بھی کچھ ان سے تو انہیں کو چاہیں
ماسوا سے نہیں کچھ کام طلب گاروں کو

۶۔ **نواب مہدی علی خاں مہدیؔ (پیدائش: ۱۲۲۴ھ/۱۸۱۸ء، وفات: ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء)**: مہدی کا اصل وطن جپلا حسین آباد ضلع پلاموتھا۔ان کے والد کا نام نواب سید جعفر حسن خاں فیضؔ تھا۔وہ محلّہ کیواں شکوہ، عظیم آباد میں مقیم ہوگئے تھے۔وہ صاحب دیوان تھے مگر دیوان تلف ہوگیا۔یہاں ان کے دو شعر درج ہیں:۔

جب شگفتہ لالہ، خونیں کفن ہوجائے گا
بے ستوں پر تازہ خون کوہ کن ہوجائے گا
ہے محیط اس مرتبہ ٹک فیض اس کے نور کا
ہر شرر ہے سنگ میں ہمسر چراغِ طور کا

۷۔ **شیخ محمد قائم نثارؔ** (بعض جگہ شیخ محمد قاسم بھی لکھا ہوا ہے): وہ دلی کے رہنے والے تھے۔عظیم آباد میں روزگار کے سلسلے میں آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ پہلے مرزا فدویؔ سے اصلاح لیتے تھے بعد میں راسخ کی شاگردی اختیار کی۔تذکرہ نگاروں اور ادیبوں نے انہیں نظر انداز کیا ہے۔ان کا کلام بھی دستیاب نہیں ہے۔

۸۔ **انور علی یاسؔ آروی (پیدائش: ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء، وفات: ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء)**: بہی پورہ، منیر شریف ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ان کے والد کا نام شیخ محمد حیات تھا۔وہ آرا قدیم ضلع شاہ آباد میں آباد ہوگئے تھے اور وہیں کی عدالت میں مفتی کے عہدے پر متمکن تھے۔انہیں ساز وسوز اور مصوری میں مہارت

تھی مگر بعد میں ان فتنوں سے دلچسپی لینا ترک کر دیا اور صوفیت کے زیر اثر زہد وتقویٰ کی زندگی بسر کرنے لگے۔ راسخ سے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ ان کا فارسی دیوان چھپ گیا تھا۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے فارسی اور اردو میں مکتوب نگاری بھی کی۔ ان کا مجموعہ مکاتیب فارسی خانقاہ پھلواری میں محفوظ ہے۔ ان کے یہ شعر مشہور ہیں:۔

آخر اس کے سب تماشائی ہوئے
جو ترا محوِ تماشا ہوگیا
عشق کی راہ میں جب تک نہ ہو جی کا نقصان
یاس تب تک نہیں ہوتا کوئی کامل ہرگز

شاعری

اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں عہد عالمگیری کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوگیا تھا۔ سیاسی ریشہ دوانیوں اور آپسی چپقلشوں سے صدیوں میں بننے والی سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی قدریں بکھرنے اور پامال ہونے لگی تھیں۔ راجدھانی دلی پر ایک طرف مرہٹے اور جاٹ دھاوا بول رہے تھے تو دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کے حملے اس پر تازیانے کا کام کر رہے تھے۔ افراتفری اور انتشار کا ایسا ماحول بن گیا تھا کہ اور لوگ جان و مال کی حفاظت کے لیے مشرقی ہندوستان کی طرف کوچ کرنے لگے مگر مرکز کی چولیں ڈھیلی ہوتے ہی ہر طرف رجواڑوں اور نوابوں سے وابستہ تہذیبی اور ادبی گہوارے بھی متاثر ہونے لگے۔ شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی اسی ہنگامی دور میں شعوری سطح پر بیدار ہوئے۔ انہوں نے اردو کی مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی۔ ان کے کل شعری سرمایے کے متعلق شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:۔

''ان کے کل کلام قریب نو ہزار ستروں میں ہیں۔۲۲۔۲۶ کاغذ کے صفحوں پر۔ جن میں سے دیوان میں قصائد ملا کر چار ہزار کے قریب شعر ہیں اور چار پانچ سو شعروں میں رباعیاں، خمسے، فردیں، مرثیے ہیں اور باقی اشعار مثنوی کے ہیں۔''(1)

جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی 'کلیات راسخ' کا لیکھا جوکھا کرتے لکھتے ہیں:۔

''مطبوعہ کلیات میں ۳۴۴ غزلیں، ۸ قصائد، ۱۵۰ قطعات مدحیہ، ۷۷ رباعیات، ۴ مخمسات، واسوخت، ۴ مرثیے (دو مسدس میں ایک مثنوی کی ہیئت میں) اور ۱۵ مثنویاں ہیں جب کہ 'مکتوب شوق' کو الگ الگ شمار کیا جائے۔ ان کے علاوہ پانچ 'مثنویات راسخ' میں درج ہیں اور اس طرح راسخ

کی کل مثنویوں کی تعداد ۲۰ ہو جاتی ہے۔''(2)

مختلف صنفوں کی تخلیقات کی یہ تعداد 'کلیات راسخ' مطبوعہ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء اور 'مثنویات راسخ' (مولفہ ڈاکٹر ممتاز احمد) سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ بعض غزلیں، اشعار، قطعات وغیرہ ہیں جو دیوان راسخ (بخط شاعر/عکسی ایڈیشن)، انتخاب کلام کے خطی نسخوں اور تذکروں میں درج ہیں۔ مختلف اصناف شاعری کے نمونے پیش کرنے کے باوجود وہ بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ انہوں نے روایت کے مطابق اپنی تخلیقی شخصیت کی بہترین آئینہ داری صنف غزل میں کی ہے۔ اس لئے جائزے میں بھی ان کی غزلیہ تخلیقات کو اوّلیت دی گئی ہے۔

غزل گوئی

دلّی سے عظیم آباد آکر مستقل سکونت اختیار کرنے والے استاد شاعر مرزا محمد علی فدوی (وفات: ۱۲۱۰ھ/ ۹۶-۱۷۹۵ء) سے راسخ نے اپنے ابتدائی کلام پر اصلاح لی۔ فدوی عربی و فارسی کے علاوہ فن موسیقی پر بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ غالباً انہیں کی صحبت میں رہ کر راسخ نے بھی ان دونوں زبانوں کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی گہری دلچسپی لی۔ وہ فدوی کی شاگردی کا بڑی انکساری کے ساتھ اس طرح اقرار کرتے ہیں:-

شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار — راسخ ہوں ایک میں بھی، و لے کس شمار میں

اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ فدوی کے نامور اور بہترین شاگرد ہیں۔ ان کے علمی و ادبی استعداد اور فکری و فنی رجحان سازی میں فدوی کا اہم حصہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نوجوانی ہی میں انہوں نے اپنی ایک پہچان بنالی تھی۔ ابوالحسن امراللہ آبادی نے انہیں عظیم آباد میں نوجوان دیکھا تھا اور ان کی شخصیت اور شاعری دونوں سے متاثر ہوئے تھے۔ اس دور کے اٹھائیس شعرا اپنے تذکرے 'مسرت افزا' (مولفہ ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء) میں درج کئے تھے (3) ان میں سے چند شعر یہ ہیں:-

شب جو اس ماہ سے روشن مری آغوش ہوئی — شمع یاں تک ہوئی شرمندہ کہ خاموش ہوئی
جب سے آیا ہوں میں دنیا میں، یہی سنتا ہوں — آج یہ نیست ہوا، آج وہ نابود ہوا
بس یار یہ کب تلک تغافل — ٹک دیکھ ادھر کہ مرچلے ہم
بن ترے کس کو نیند آتی ہے — روتے ہی روتے رات جاتی ہے
دمبدم دل کو اضطرابی ہے — بن ترے آہ یہ خرابی ہے

سرگذشت چشم نم کس سے کہیں — کون سنتا ہے یہ غم، کس سے کہیں

ان غزلیہ شعروں میں عشقیہ جذبات کا وفور، آفاقی سچائی اور ذاتی کرب ہے، معنی آفرینی ہے اور اظہار کی سطح پر لفظوں کا برمحل استعمال، سادگی اور سلاست سے بیان کا جادو جگانے کی کوشش ہے۔ اس طرز سے ظاہر ہوتا ہے کہ راسخ نے گہرے مطالعے اور ریاضت سے اپنا ایک شعری اسلوب وضع کرلیا تھا اور بڑی مہارت سے الفاظ اور تراکیب کو برتنا سیکھ چکے تھے۔ ابوالحسن امراللہ آبادی کی طرح سید غلام حسین شورش عظیم آبادی نے بھی اپنے تذکرے 'رموز الشعراء' (مولفہ ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء) میں ان کے کئی شعر نقل کئے ہیں (4) چند شعر یہ ہیں:-

گلی سے تری اب کدھر جایئے — تجھے دیکھئے اور مر جایئے
بعد مدت کے ملے ہو سر رہ، ٹک ٹھہرو — تم ادھر جاؤگے، آخر ادھر جاؤں گا
گریباں چاک و نالاں کیوں پھرے ہے در بدر بھٹکا — کدھر آنکھیں لڑیں راسخ کہاں دل ان دنوں بھٹکا
بہ رنگے برق دکھلائی نہیں دیتا قیام اپنا — کوئی پوچھے تو بتلاؤں کہاں یارب مقام اپنا

یہ اشعار راسخ کے جوان جذبات کے ترجمان ہیں۔ ان میں سیدھے سادے اور عام فہم لفظوں کے برجستہ استعمال اور بیان کی بے ساختگی قابل تعریف بھی ہے اور ان کے مستقبل کا بادنما بھی ہے۔ چوتھے شعر میں جس طرح عارضی زندگی کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، وہ ان کی فکری اٹھان کا خوبصورت نمونہ ہے۔

وجیہہ الدین عشقی نے بھی اپنے تذکرے (مولفہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء) میں راسخ کو خوش فکر جوان بتایا ہے اور یہ اشعار شامل کئے ہیں (5)۔

زاہد کجی سے اپنی منزل تلک نہ پہنچا — کعبہ تلک تو پہنچا ہر دل تلک نہ پہنچا
کل وہ شرارتِ پیشہ مجھ کو روتا دیکھ کے ہنستا تھا — چمک رہی تھی اُدھر بجلی ادھر مینہ برستا تھا

مذکورہ تینوں تذکرے اس دور میں لکھے گئے جب راسخ جوان تھے اور مستقل طور پر عظیم آباد میں مقیم تھے۔ نہ وہاں سے کسی دوسرے شہر گئے تھے اور نہ میر کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے تھے۔ ان تذکروں میں راسخ کے جو اشعار شامل ہیں، ان کے موضوعات اور اسالیب کم و بیش ایک ہی نوع کے ہیں۔ لہٰذا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آسان اور عام بول چال کے لفظوں اور رواں زبان میں شاعری کرنے کا گر انہوں نے اپنے بنیادی استاد

مرزا فدوی کے فیض سے بھی سیکھا ہوگا اور عظیم آباد کے ادبی ماحول سے بھی حاصل کیا ہوگا۔ نیز اپنے مطالعے اور ذہنی مطابقت کی وجہ سے دہلوی شعری روایت کی طرف مائل ہو کر ایسے مشاق ہو گئے کہ ایک عرصہ بعد جب راسخ لکھنو گئے اور میر سے اصلاح لینا چاہی تو بقول شاد عظیم آبادی ''میر صاحب کی اجازت پا کر انہوں نے جا بجا سے اپنے دیوان کی غزلیں پڑھیں۔ میر صاحب خوش ہوئے اور فرمایا کہ تمہارے کلام ایسے ہیں گویا میں دیکھ چکا ہوں۔ کسی جگہ اصلاح کی ضرورت نہیں دیکھتا۔'' (6) پھر بھی راسخ کے اصرار پر بعض شعروں میں ہلکی پھلکی ترمیم کر دی مگر وہ میر کی شاگردی کا ہمیشہ دم بھرتے رہے:۔

یارب رہیں سلامت تا حشر حضرت میر | فیض سخن نے ان کے میرا سخن بنایا
سخن تیرا ہے استادانہ راسخ | تو شاگرد جناب میر ہے کیا

اسی کے ساتھ تعلّی کے شاعر میں وہ میر کی ہمسری کا بھی دعویٰ کرتے ہیں:۔

مایہ دار سخن اب کون ہے ہم سا راسخ | شاہ اقلیم معنی ہوئے ہم میر کی طرح
استاد فن ریختہ راسخ ہے بعد میر | اب شاعروں میں ہند کے ایسا کہاں ہے اور
نظیری اور شفائی کا ہے بدل راسخ | یہ اس کا فخر نہیں گر نظیر میر ہوا

راسخ نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی عمدہ شاعری کی ہے۔ فارسی میں غالباً وہ شاہ محمد نور الحق تپاں (۱۱۵۶ھ/۱۷۴۱ء-۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء) سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ (7) راسخ کے مطبوعہ کلیات (8) سے ایک فارسی قطعہ اور ایک رباعی یہاں نقل ہے:۔

سیر معراج فنا را قوتی درکار نیست | چوں شرر می باید اندک ہمتی ور زید و رفت
سوی مقصد نیست راہی از فنا نزدیک تر | می تواں بی منت پا چشم را پوشیدہ رفت

☆☆

گر بادہ خوری تو باخرد مندان خور | یا با صنم لالہ رخ خندان خور
بسیار مخور و ردمکن فاش مساز | اندک خور و گدگاہ خور و پنہان خور

ان کی فارسی غزل کے یہ دو شعر بھی بڑے فکر انگیز ہیں:۔

خوں شد جگر وفائے عاشق | فریاد ز بے نوائی تو
آلودۂ مے خوش است راسخ | ایں خرقہ پارسائی تو (9)

اردو اور فارسی کلام سے عیاں ہے کہ راسخ شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے اور ہر دو زبان میں لفظوں کے شعری استعمال کے سلیقہ شعار تھے۔ کلیات اور دیوان وغیرہ کے مشمولہ کلام سے یہ صاف ظاہر ہے کہ راسخ نے فن غزل گوئی کی کنہیات پر خاص توجہ دی ہے اور کلاسیکی اردو غزل کے اہم موضوعات اور اسالیب کو نہ صرف بڑی احتیاط اور ہنرمندی سے برتا ہے بلکہ اپنے تخلیقی شعور اور اختراعی صلاحیت سے اظہار کی تازہ کار جہتیں بھی سامنے لائی ہیں۔ دیکھئے بالکل اچھوتے اسلوب اور دلآویز ترکیب میں خیال کتنی شگفتگی اور حسن کے ساتھ سما گیا ہے اور ایک جہان معنی کا مظہر بن گیا ہے:۔

آغوش میں لفظوں کے ہیں کیا کیا گل معنی | تو نے تو بنایا چمن سطح ہوا کا

موضوعاتی سطح پر راسخ کی غزلیاتی دنیا بہت وسیع، بوقلموں اور کثیر الجہات ہے۔ عشق مجازی کی رنگینیاں، محبوب کے حسن و جمال، ناز و ادا، عاشق کی بدگمانیاں، یاس و حسرت کے ساتھ واردات زمانہ، بے مروتی اقربا، ناہموارئ حیات وغیرہ ان کی تخلیقی شخصیت کو مضطرب کئے ہوئے تھی۔ ان سب کا ملا جلا رنگ غزلوں میں عکس پذیر ہوا ہے۔ تاہم انہوں نے اس میں سنجیدگی، صبر اور تحمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ نرم اور شستہ لفظوں، ترکیبوں، محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کے انتخاب اور استعمال میں ہوش مندی، احتیاط اور معیار کا عموماً لحاظ ہے۔ اس طرح اظہار و بیان میں بے ساختگی، برجستگی اور شگفتگی آ گئی ہے۔ الفاظ کا موسیقیائی اور غنائی پہلو بھی ابھر کر سامنے آیا ہے:۔

زندگی کرنے کا ہم ڈھنگ ہی بھولے تجھ بن | ورنہ یہ مہلت کم، کاٹنا دشوار نہ تھا
آنکھ اپنی بھی اب اس سے لگی دیکھئے کیا ہو | جس شوخ نے بہتوں کو تہہ خاک سلایا
وہ تو زلفوں میں منہ چھپا بیٹھے | اپنی شب ہم سیر کریں کیسے
خوبی کو تمہاری نہ پری پہنچے ہے نہ حور | تم رشک جمال پری و حور ہو صاحب
اس کے ساعد کی خوبی کے آگے | کس روش سبز ہووے گل کی شاخ
حیرت کی وجہ پوچھو ہو منہ کو چھپا کے تم | حیراں ہوں اس سوال کا دوں میں جواب کیا
انداز خرام اس کا آفت ہے | برپا کئے ہیں فتنے سر اُن کے کٹائے ہیں
بے خودی آ و رہے وہ تصویر سا چہرہ بہت | پشت پر دیوار ہی اس کا تماشائی رہا
ایک شب وے گل آغوش ہوئے تھے سو ہنوز | پیرہن پیرہن گل سے ہے خوشبو میرا

راسخ مادی محبوب کے سحر انگیز حسن و جمال اور عشقیہ واردات، تصورات اور تجربات سے فطرت انسانی کے مطابق محظوظ تو ہوتے ہیں مگر ایک خاص دائرے میں اور ایک خاص سطح تک۔ ان کے ہاں لطف، انبساط سے بھری خارجیت کا ایک معیار ہے۔ سطحیت، رکاکت اور عریانیت سے وہ اپنا بیان آلودہ نہیں کرتے بلکہ اس پر اشارے کنائے کی ایک چادر تان دیتے ہیں۔

راسخ عشق میں ناکامیوں اور نامرادیوں سے مایوس نہیں ہوتے ہیں۔ وہ مختلف حوصلہ شکن واقعات کو نامیاتی زندگی کا جز و لاینفک سمجھتے ہیں۔ طبعاً یاس پسند یا قنوطی نہیں ہیں اس لئے تکلیف دہ اور ناگوار واردات اور واقعات کو مثبت انداز سے دیکھتے ہیں اور کڑوے پن میں لطف و انبساط کا پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں جو دراصل صوفیت اور 'مرضی مولیٰ از ہمہ مولیٰ' پر کاربند ہونے کا نتیجہ ہے۔

ان کے ہاں محبوب کی بے التفاتی، سنگ دلی اور ہجر کے ساتھ ساتھ زمانے کی بے رخی سے پیدا ہونے والے دلخراش احساسات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ مگر راسخ انہیں برداشت کرتے ہیں۔ رنجیدہ اور مضطرب ہوتے ہیں۔ حسرت تہہ نشیں اور تشنگی میں مبتلا ہوتے ہیں پھر بھی دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ دراصل ان کے مزاج میں ایک نوع کی صوفیت ہے جو انہیں بکھرنے نہیں دیتی ہے۔ نیز وہ تلخ احساسات کو عام فہم زبان کے شیریں، ملائم اور سدا بہار لفظوں، تر و تازہ ترکیبوں اور پر کیف لہجے میں ڈھالنے کا گُر جانتے ہیں:۔

مدت ہوئی آمیزش بے جا نہیں جاتی
اس گل کو ہے صحبت وہی ہر خار سے اب تک

نازاں ہوں اپنے قلبِ شکستہ کی شان پر
ہے عرش کو حسد اسی ٹوٹے مکان پر

ورق آب زدہ سا ہے مرا نسخہ عمر
صفحۂ ہستی سے جوں صرف اٹھایا ہے مجھے

دل خوں تھا، دیدہ خوں فشاں تھا
تم بن عجیب ایک رنگ یاں تھا

ضبط گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے
قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

یوں جگر نے لی دلِ پُرداغ بردار سے آگ
لاوے جوں ہمسایہ، ہمسائے کے جا کر گھر سے آگ

پوچھو مت عشق کے ذوقِ غم پنہائی کو
کیجئے کس طرح بیاں لذت روحانی کو

انہوں نے آس پاس کی زندگی، سماج، تہذیب اور اقتصادی توازن میں بدلاؤ اور تنزلی سے پیدا ہونے والے کرب کو جھیلا ہے اور اسے اپنے وجود میں گھلا کر نگار خانۂ فن کا حصہ بنایا ہے۔ اسی کے ساتھ اپنی

طینت کی غیرت مندی اور انانیت کا بھی جا بجا اظہار کیا ہے:۔

عجب افزوں مرا شاہوں سے ہے پر ہوں درویش
نہ سکندر ہوں نہ دارا ہوں نہ فغفور ہوں میں

وہ زندگی کے نشیب و فراز پر مثبت نگاہ ڈالتے ہیں اور جینے کا گن جانتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی آرزومندی کبھی کبھی انگڑائی لیتی رہتی ہے:۔

شاید کبھو خیال میں جاناں کے گذریں ہم
وابستہ زیست اپنی ہے اب اس گمان پر

انہوں نے زندگی اور سماج کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس کے اونچ نیچ سے گذرے ہیں۔ کھرے اور تلخ تجربے حاصل کئے ہیں۔ بعض معاملوں میں سچ اور جھوٹ کا ٹکراؤ دیکھا ہے اور باطل کی جیت سے مضطرب ہوئے ہیں۔ دیکھئے وہ کس طرح ایک کھردری سچائی پیش کرتے ہیں:۔

اکثر ہے یہ کہ جھوٹے ہی ہوتے ہیں کامیاب
جاتا ہے پیش راستی سے پیشتر دروغ

کیا عہد ہے کہ سچے کو احمق کہے ہے خلق
دانا وہی ہے اب جو کہے سربسر دروغ

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، راسخ زندگی بھر مالی پریشانیوں کا سامنا کرتے رہے۔ انہوں نے بہتری کی خاطر مختلف شہروں کا سفر کیا مگر ابتلاؤں اور آزمائشوں میں کمی نہ آئی۔ آخر کار انہوں نے مکروہات دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنے سیر و سیاحت اور اپنی افتادگی دونوں کی توجیہہ و تاویل اس طرح کی ہے:۔

دست کاری پہ نظر تھی چمن آرا کی ہمیں
اس لئے حظ ہمیں سیر گل و گلزار سے تھا

شکر کرتا ہوں اے افتادگی تیرا ہر دم
مرتبہ تونے کیا ارفع و افضل میرا

مشرقی شعریات میں خالق اور مخلوق کے نازک رشتے پر اظہار خیال کرنے کی ایک روایت رہی ہے۔ شاعر پہلے عشق مجازی کی بھول بھلیوں میں گم ہوتا ہے پھر اسی راہ سے عشق حقیقی تک رسائی کرتا ہے اور اس کے لیے کسی صوفی کا دامن تھامنا بھی لازمی ہے۔ راسخ نے بڑے صاف ستھرے انداز میں اس کا اظہار کیا ہے:۔

شہوں کا ربط کام آیا نہ راسخ
کرو پیدا کسو درویش سے ربط

اس فیصلے کے بعد جب راسخ ایک مقامی بزرگ شاہ ابوالحسن فرد کے حلقۂ ارادت میں آتے ہیں تو ان کی طبع بے نیاز میں مومنانہ شان نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ مادی وجود کے عارضی ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے:۔

مسافرانہ رہے ہم جہاں میں راسخؔ　　لگایا ہم نے تو قصداً نہ اس سرا سے دل

کچھ نہیں اندیشۂ سیل حوادث ان کے تئیں　　ہے حباب آسا سبک باروں کا مسکن آب پر

اس کے بعد راسخؔ ذات خداوندی کی طرف رجوع ہونے کی ترتیب دیتے ہیں:۔

ہے اس کی جستجو واجب سبھوں پر جن نے اے راسخؔ　　بایں خوبی و رونق عالم امکاں کیا پیدا

جلد ہی ان پر منکشف ہوتا ہے کہ انسان شناسی ہی خداشناسی کی بنیاد ہے۔ وجود ازل کا عرفان اپنی ذات کی نفی کئے بغیر ممکن نہیں ہے:۔

پائے گا اس بے نشاں کا کچھ تو اے راسخؔ نشاں　　آپ کو کھوکر جو بے نام و نشاں ہوجائے گا

معنی کے تئیں ہم نے تو صورت ہی میں پایا　　تجھی میں تو جلوہ ہے اس خود نما کا

الفت حسین فریادؔ (استاذ شادؔ عظیم آبادی) اور خواجہ محمد شاہ شہرتؔ (فریادؔ کے ہمعصر) نے راسخؔ کا بڑھاپا دیکھا تھا۔ جب وہ خانقاہوں میں صوفیانہ کلام پڑھتے نظر آتے تھے۔ غالباً اس زمانہ میں وہ قریب قریب ترک دنیا کر چکے تھے اور خانقاہوں میں علم معرفت کی تحصیل میں براجمان رہا کرتے تھے یہ منزل بہت کٹھن ہے۔ آسانی سے سر نہیں ہوتی۔ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسرار الٰہی کی آگاہی کے لئے سرگرداں تھے مگر ایک عرصے تک کسی منزل پر نہیں پہنچ سکے تھے:۔

نسبت نہیں کچھ معرفت یار سے اب تک　　محرم نہ ہوئے اس کے اسرار سے اب تک

اصل میں دنیاوی آلائشوں سے نجات، مادیت کی تسخیر سے روحانیت کی تقدیس تک کا سفر اور کثافت سے لطافت تک پہنچنے کا مرحلہ بڑا دشوار گزار ہے۔ اس منزل تک رسائی ذات کو کچلے بغیر ممکن نہیں۔ تصوف بنیادی طور پر اسی تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کا علم اور عمل ہے۔ اس کا اصل مقصد انسانی دل کو ہر طرح کی آلودگی سے پاک کرنا ہے۔ انسان کی باطنی تطہیر کرنا ہے تاکہ وہ اپنی خواہش خبیثہ پر قابو پا سکے۔ باطن کے توسط سے اس کا ظاہر مستحکم اور پختہ ہوسکے۔ وہ اوصاف حمیدہ کے ساتھ مومنانہ اوج پر پہنچے۔ ظاہری اور باطنی سطح پر نظم وضبط، صبر وتحمل اور اخلاص وایثار کا ایک نمونہ بن جائے تاکہ دوسرے افراد معاشرہ کے لیے بھی وہ اصلاح اور ہدایت کا ذریعہ بنے۔

بعض قلمکاروں نے تصوف پر تنقید کرتے ہوئے اسے انفعالی علم قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ تصوف ہمیشہ انتشار اور زوال کے دور میں پنپتا ہے مگر وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ صوفی دور انتشار

میں انسانوں کو بددلی اور مایوسی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔ انہیں حوصلہ دیتا ہے۔ ان کے دل میں ہر حال میں جینے کی جوت جگاتا ہے۔ بلاتخصیص مذہب وملت انسانوں کو آپس میں محبت واخوت کی ڈور سے باندھتا ہے۔ نرمی، بے لوثی، اخلاص، ایثار اور رواداری سے امن وآشتی کا پیغام دیتا ہے۔ زوال آمادہ سماجی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں میں ارتباط پیدا کرتا ہے۔ انسان، سماج اور زندگی میں ہم آہنگی لانے کی جدوجہد کرتا ہے۔

جہاں تک تصوف کے فکری اور نظریاتی نکتوں بالخصوص وحدت الوجود اور وحدت الشہود، ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کا سوال ہے، اس ضمن میں اسلامی مفکروں کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ دراصل برصغیر میں تصوف پر زرتشتی اور ویدانت فلسفے کے اثرات بھی ہوئے ہیں اور مذکورہ بالا دونوں نکتوں کی توجیہات میں خاص الجھاؤ آیا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے متعلق جید مفکر محی الدین ابن العربی اور ولی کامل مجدد الف ثانیؒ کے حوالے سے جمیل جالبی لکھتے ہیں:۔

> ''ابن عربی نے جہاں جائنات کہ وجود حق کا عکس قرار دیا ہے وہاں وہ کائنات کو غیر حقیقی نہیں کہتے بلکہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح سائے کا وجود بغیر اصل کے قائم نہیں رہ سکتا اسی طرح کائنات کا وجود، وجود حق کے بغیر ناقابل تصور ہے۔ اس تشریح کی رو سے کائنات غیر حقیقی نہیں بلکہ حقیقی ہے مگر موجود بالغیر ہے۔ مجدد الف ثانی وحدت الشہود تک کئی منزلوں سے گذر کر پہنچے تھے۔ پہلے انہیں وحدت الوجود کا تجربہ ہوا جس میں انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا وجود صرف خدا کی ذات میں ہے اور اپنا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔ آگے بڑھ کر انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا اپنا وجود خدا کے وجود کا ظل (سایہ) ہے اور اسی طرح اس کے وجود سے جدا ہے جس طرح سایہ اصل سے جدا ہوتا ہے۔ یہ ان کی اصطلاح میں ظلیت ہے۔ باطنی شعور کی مزید ترقی کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کا اپنا وجود خدا سے مختلف ہے اور اس کی ہستی خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ خدا کے تابع ہے تاہم اس سے جدا ہے۔ یہی حقیقی حالت تھی یعنی عبودیت کی حالت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ خدا سے جدا

تھے تو انہوں نے خدا سے اتحاد کیسے محسوس کیا۔ اس کا جواب ان پر یہ منکشف ہوا کہ پہلا مشاہدہ ان کے 'سکر' کا نتیجہ تھا جس میں خدا کی محبت کے باعث وہ قلبی ہیجان میں اس طرح ڈوب گئے تھے کہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اس سے جدا نہیں ہیں مگر اس احساس نے اسے حقیقت نہیں بنا دیا۔ اسی لیے وحدت وجودی نہیں، شہودی ہے۔''(10)

اردو کے دوسرے اہم شاعروں کی طرح راسخ کی شاعری کا ایک اہم محور عشق ہے۔ وہ عشق کے مجازی اور مادی رنگ سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس میں ڈوبتے ابھرتے ہیں۔ تلطف وتلذذ کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ ہجر اور فراق کی پُر درد کیفیتوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ زمانہ اور سماج کے ستم سہتے ہیں پھر آہستہ آہستہ حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنی آگہی کا ثبوت دیتے ہیں:۔

مجاز آئینہ دار حسن محبوب حقیقی ہے   وہ بے معنی ہے جس کے تئیں نہ ہو شوق اچھی صورت کا

خواجہ میر درد کی طرح راسخ سرتا سر صوفی شاعر نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں یقیناً صوفیانہ عناصر موجود ہیں جو زندگی کی مادی حقیقتوں کے توسط سے داخل ہوئے ہیں۔ اس لیے اظہار جذبات میں بھی اس کا عکس موجود ہے:۔

پوچھو مت عشق کے ذوقِ غمِ پنہانی کو   کیجئے کس طرح بیاں لذتِ روحانی کو

راسخ ایک عاشق صادق ہیں۔ وہ عشق حقیقی میں مبتلا ہو کر اپنی ذات سے اوپر اٹھنے لگتے ہیں۔ اپنی ذات کو بھولنے لگتے ہیں اور ان میں انسان کے بہترین اوصاف ـــــ اخلاص، مروت، ایثار، استغنا، بے لوثی، بے ریائی، وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یعنی عشق انہیں اندر سے روشن کرتا ہے۔ ان کی تطہیر قلب کرتا ہے اور بعض عارفانہ نکتے واضح کر دیتا ہے:۔

کسو طرح نہیں روغن سے یہ فروغ پذیر   چراغِ عشق میں خوں چاہئے تمنا کا
ہے گل عشق کے بو کرنے میں تاثیر عجب   روح بالیدہ ہو تن سوکھ کے کانٹا ہووے

وجود انسانی میں دل اور دماغ کا مرکزی کردار ہے۔ دل جذبہ (عشق) کی آماجگاہ ہے۔ اس کے برعکس دماغ، عقل کا سرچشمہ ہے۔ انسان کے مادی وجود میں عقل اور عشق دو ایسی حرکی قوتیں ہیں جو اسے اپنے اپنے انداز سے متحرک رکھتی ہیں۔ عقل مادی حوالہ رکھتی ہے اور ہمیشہ مصلحت اندیشی اور سود وزیاں

سے آشنا کراتی ہے جب کہ عشق تمام مادی اندیشوں اور وسوسوں سے مبرّا ہوتا ہے اور مقصد میں براری کے لئے اس کی ایک جست ہی کافی ہے۔ یعنی عقل اور عشق کے دائرہ کار میں تضاد ہے۔ تصوف میں عشق کی بالادستی پر زور ہے اور عقل اس کے تابع ہے:۔

عشق کا ہورہ کہ دل سب سے اٹھا دیتا ہے عشق   عقل کے الجھاؤ سے دم میں چھڑا دیتا ہے عشق
رفتہ سا میں اپنے ادراک حقیقت میں رہا   کون ہوں کیا ہوں نہ سمجھا بند حیرت میں رہا
عقل نے چاہا تو تھا کھینچے مجھے اپنی طرف   لیک جانب دار اپنا عشق زور آور رہا
دل تنگ اپنی وسعت کتنی رکھتا ہے یہ کیا جانوں   پر اتنا جانتا ہوں میں کہ تو اس میں سمایا ہے

عشق ہی میں وہ قوت ہے جو ایک سالک کو وحدت خداوندی سے ہمکنار کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کی بہت عمدہ وضاحت کی ہے:۔

''عشق کا یہ تصور جو اردو و فارسی شاعری میں عام ہے 'توحید' کے تصور کا حصہ ہے۔ عشق کا یہ تصور انسان کو تضاد اور دوئی سے ہٹا کر توحید کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ وہ مابعد الطبیعیات ہے جسے آج مغرب کے جدید تصورات نے بظاہر بے معنی کر دیا ہے۔ مغربی فکر میں عقل اور جذبے، ذہن اور جسم، روح اور مادے کے درمیان کشمکش کا عمل جاری ہے جس سے نئے نئے تضاد پیدا ہو رہے ہیں۔ ہماری شاعری اور تصوف میں جو تصور عشق ہے وہ دراصل من عرف نفسہ فقد عرف ربہ، کا ایک حصہ ہے۔ آخرت وعافیت کا تصور بھی اسی مابعد الطبیعیات کا حصہ ہے۔ عشق جسم اور روح کو ایک وحدت سمجھتا ہے لیکن عقل اسے الگ الگ سمجھتی ہے جس سے زندگی میں نئے نئے تضاد جنم لیتے ہیں۔ اردو شاعری نے اس مخصوص مابعد الطبیعیات کے زیر اثر اسی لیے عشق پر زور دیا اور جدید مغرب نے عقل پر۔ اس تصور عشق میں سارے علوم کی بنیاد وحی پر ہے۔ راسخ بھی اسی تصور عشق کے ترجمان ہیں۔''(11)

اس بزم میں جو مست تھا ہشیار وہی تھا   تھی بے خبری جس کو خبردار وہی تھا
ہووے مسجود ملائک کب یہ رتبہ خاک کا   اس میں اک سرّ ہے کہ دل خوں کن ہے وہ ادراک کا

راسخ عشق ہی کے وسیلے سے وجود ازل کے مختلف جلوؤں سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ کائنات اور اس کے نت نئے مظاہر کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔ وجود ازل کے حسن و جمال کے نظاروں سے محظوظ بھی ہوتے ہیں اور اس نکتے تک رسائی بھی حاصل کرتے ہیں کہ انسانی وجود دراصل وجودِ ازل کا عکس یا سایہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک لطیف پردہ حائل ہے۔ وہ اس امر کے اظہار میں کبھی 'ہمہ اوست' یا وحدت الوجود اور کبھی 'ہمہ از وست' یا وحدت الشہود کے نظریے سے قریب ہو جاتے ہیں۔ ایسے شعروں میں ایک پاکیزہ رمز کے ساتھ ساتھ معنی خیزی بھی ملتی ہے:۔

معنی کے تئیں ہم نے تو صورت ہی میں پایا   نقاش ہمیں نقش کے اندر نظر آیا
بھٹک مت جو طالب ہے راہ خدا کا   تجھی میں تو جلوہ ہے اس خود نما کا
جوں تخم میں ہو صورت اشجار نہ ظاہر   تھا علم میں صانع کے نہاں اب جو بنایا
پردہ رخ معشوق کا ہے ہستی ہماری   کیا اپنے تئیں بیچ سے مشکل ہے اٹھانا
مجاز آئینہ دار حسن محبوب حقیقی ہے   وہ بے معنی ہے جس کے تئیں نہ ہو شوق اچھی صورت کا
سر بازار وجود آپ سے آیا نہیں میں   جلوہ دکھلانے کو اپنے کوئی لایا ہے مجھے
مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا   دید کو اپنی یہ آئینہ اسے درکار تھا
علم ہستی کا حجاب رخ دلدار ہے آہ   کیا تماشا تھا یہ پردہ جو نہ حائل ہوتا

اکثر قلمکاروں کا خیال ہے کہ راسخ موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے میر سے بہت قریب ہیں۔ غم دوراں اور غم جاناں کا سوز و گداز دونوں کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے اور راسخ نے اسلوبیات میر کی پیروی کی ہے۔ ڈاکٹر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:۔

''......صنف غزل کو برتنے میں انہوں نے بھی اسلوب میر جیسی حساسیت اور ندرت کا اظہار کیا۔ ان دونوں با کمال شاعروں کے اسلوب سخن میں اتنی مشابہت اور مماثلت ہے کہ راسخ کو 'ثانی میر' قرار دیا گیا۔ دروں بینی اور داخلیت پسندی ان دونوں ہی شعرا کے اسالیب سخن کا ایک امتیازی مشترک پہلو ہے۔''(12)

بعد میں ڈاکٹر لطف الرحمٰن اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:۔

''یہ ٹھیک ہے کہ اسلوب میر کا اثر کلام راسخ میں نمایاں ہے مگر یہ تقلید محض نہیں ہے۔ اگر صرف تقلیدی روش ہوتی تو اس میں تصنع کا در آنا لازمی تھا۔ شاعری بے اثر اور بے نمک بن جاتی۔ راسخ و میر کو کم و بیش ایک طرح کی معاشرتی، سیاسی، سماجی، اور معاشی صورت حال کی ابتری و زبوں حالی سے گذرنا پڑا تھا، اس لیے ان کے حسّی اور فکری ردعمل میں یک رنگی کا ہونا لازمی تھا۔ پھر دونوں ہی نے اپنی شاعری کو ایک نفسیاتی پناہ گاہ تصور کیا اور اپنے شخصی تجربات اور ذاتی واردات کے اظہار کے لیے شاعری کو وسیلۂ اظہار بنالیا۔''(13)

انہوں نے میر اور راسخ کے درج ذیل شعر بھی دلیل کے طور پر نقل کئے ہیں:۔

میر	راسخ
دفتر لکھے ہیں میر نے دل کے الم کے یہ یاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہوگیا	عمر بھر ہم خوش رہے غم کی کفالت کے سبب راسخ اپنی زندگی کا یہ تو سرمایہ ہوا
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا	نہ شاعروں میں کہو تم اسے کہ راسخ تو دل ستم زدہ کا اپنے مرثیہ خواں ہے
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو شہر دلّی میں ہے سب پاس نشانی اس کی	راسخ تو آہ مرثیہ گو اپنے دل کے ہیں رونا رُلانا بس یہی ان کا شعار ہے

ان شعروں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی مماثلت ہونے کے باوجود لہجے میں مغائرت ہے۔ ان سے راسخ کے انداز بیان کی انفرادی جہت بھی ہلکے پھلکے طور پر سامنے آئی ہے۔ اگر ذیل میں درج یہ شعر بھی پیش نظر رہیں تو راسخ کی انفرادیت مزید واضح ہوگی:۔

آنسو نکلے کہ ہوگیا طوفاں   تھا جو پردے میں آشکار ہوا
راسخ خودی کو دخل نہیں بزم یار میں   یوں جاؤں واں کہ اپنے تئیں بھی خبر نہ ہو
دل کی کرو سیر آنکھوں کو تم موند کے راسخ   اس گھر میں پھرا چاہو تو دروازہ لگا دو

لے جا تو آن کر مجھے پیش از وداعِ یار   اے بے خودی پہنچ کہ ترا انتظار ہے

ان اشعار میں راسخ نے بڑی ہنر مندی سے جذبہ واحساس کا ایک آمیزہ پیش کیا ہے جس میں رچاؤ ہے، کسک ہے، حسرت زدگی ہے، اضطرابی کیفیت ہے، حسن بیان ہے اور معنی آفرینی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ سودا کے لب ولہجہ، میر کے حزن اور درد کی صوفیت کے امتزاج سے ایک منفرد آہنگ شعر وضع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے بھی راسخ کے انفرادی رنگ کے متعلق اشارہ کیا ہے:۔

''راسخ، میر کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں اور عظیم آباد میں انہیں میر کی حیثیت دی جاتی ہے۔ لیکن جس طرح بنگال کے لوگ وحشت کو غالب ثانی سمجھتے ہیں تقریباً یہی صورت بہار میں راسخ کی ہے لیکن دونوں باتیں غلط ہیں۔ اس لیے کہ کسی کے اسلوب یا مزاج کی پیروی متعلقہ شخص کے حوالے سے اس کی ایک پہچان تو بناتی ہے لیکن ایک دوری کے ساتھ۔ یہی صورت راسخ کے یہاں بھی ہے۔ میرے خیال میں انہیں ثانی میر کہنا کچھ زیادہ درست نہیں بلکہ ان کے جوہر کی الگ سے شناخت ممکن ہے جو بالکل ان کے اپنے احوال و کردار پر مبنی ہو سکتی ہے۔''(14)

ڈاکٹر اختر اورینوی نے بہت پہلے اسی نکتے کی نہ صرف وضاحت کی تھی بلکہ ان خصوصیتوں اور لسانی اوصاف کی نشاندہی بھی کر دی تھی، جن کی بنا پر راسخ اور میر کی الگ الگ شناخت ہوتی ہے۔ دیکھئے اختر اورینوی کا بیان:۔

''اسلوب بیان اور طرز بیان میں بھی میر اور راسخ اپنا علیحدہ علیحدہ قماش فن پیش کرتے ہیں۔ میر کے یہاں سادگی، بھولا پن اور معصومیت پائی جاتی ہے۔ میر کی طرز نگارش اردو اسالیب بیان میں اس دبستان کی طرف جھکی ہوئی ہے جس میں ہندوستانیت زیادہ ہے۔ میر بھاشا کے نرم، رسیلے اور لچکدار لفظ بھی برمحل استعمال کرتے ہیں اور یہ ادا ان کے کلام میں وہ سوز وساز پیدا کرتی ہے جو بھاشا کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ لیکن راسخ عظیم آبادی کی طرز نگارش

نسبتاً فارسیت کی طرف مائل ہے۔ ان کے الفاظ، ان کی ترکیبیں، ان کی تشبیہیں اور ان کے استعارے میر کی نسبتاً زیادہ ایرانی پن لئے ہوئے ہیں۔ راسخ کی طرز رنگین، رواں اور چمکیلی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ راسخ کے یہاں سادہ کاری کے نمونے نہیں ملتے بلکہ مجموعی طور پر راسخ کا اسلوب بیان میر سے نسبتاً زیادہ رنگین ہے۔''(15)

اس تجزیے کی روشنی میں دونوں شاعروں کے چند ہم موضوع شعر ملاحظہ ہوں:۔

میر	راسخ
میر ان نیم باز آنکھوں میں	دور میں اس کی مست آنکھوں کے
ساری مستی شراب کی سی ہے	محتسب بھی شراب خوار ہوا
جز مرتبۂ کُل کو حاصل کرے ہے آخر	تربیت وجہ ترقی ہے جو ہو استعداد
یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا	قابلیت ہو تو پھر قطرہ بھی دریا ہو جائے
غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ	وہم کی سی ہے نمود اپنی جہاں میں راسخ
یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب	فی الحقیقت نہیں کچھ گرچہ نمودار ہیں ہم
کہتے تھے اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے لیک	تھا جی میں کہ دشواریٔ ہجر اس سے کہیں گے
وہ آ گیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات	پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر	الفت سے ساز کر کہ اس کو
دل ہو نہ گیا گداز تیرا	آتا ہے دل گداز کرنا

تلاش کرنے سے اس طرح کے اور بھی شعر مل جائیں گے۔ سادہ، سلیس اور شستہ زبان میں راسخ نے بھی شعر کہے ہیں تاہم ان کا لہجہ میر سے مختلف ہے۔ فارسی الفاظ، ترکیبیں اور بندشیں ایک الگ اسلوب کی تشکیل کرتی ہیں۔ ایک الگ لہجہ بناتی ہیں جس کا تاثر میر سے بالکل مختلف ہے۔ ایسے موقعوں پر لہجے اور معنی آفرینی کے لحاظ سے وہ سودا سے قریب ہو جاتے ہیں۔ ان کے شعروں میں وہ سوز، وہ کسک، وہ مدھم لے اور وہ دھیما دھیما اور تھما تھما تاثر نہیں ہے جو میر کے بہتر نشتر کا امتیازی وصف ہے اور جس کا وہ دعویٰ بھی کرتے ہیں:۔

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

میرؔ کے کلام میں کئی جگہ مبتذل، رکیک اور فحش اشعار بھی ملتے ہیں۔ امرد پرستی اور شہدا پن سے بھرے بھدے اشعار سنجیدہ، متین اور فصیح اشعار کے ساتھ ایسے ملے ہوئے ہیں کہ دیوان رطب و یابس کا مجموعہ بن گیا ہے۔ غالباً اسی سبب تذکرہ 'مجمع النفائس' میں تقی اوحدی کے حوالے سے یہ الفاظ ملتے ہیں۔۔۔۔
''در ہمہ اشعار او بلند و پست بے شمار است۔ اگر چہ پستش اندک پست است امّا بلندش بغایت بلند۔'' (16) اس کے برعکس راسخؔ کے کلام میں ایک نوع کی شائستگی ہے۔ نظم وضبط ہے۔ موضوعات کا ایک ہموار دائرہ ہے۔ قاری وسامع کا پاس لحاظ ہے۔ حسن وعشق کی سرمستی، شوخی، بدمست چھیڑ چھاڑ، کھینچ تان اور جنسیت وشہوانیت کے مظہر شعری اظہار سے گریز ہے جو راسخؔ کی شاعرانہ اور شخصی عظمت کی دلیل ہے۔ کلام کی اس خصوصیت کی بنا پر انہیں اپنے عہد کا ایک مہذب، محتاط، مشّاق اور ممتاز غزل گو قرار دیا جائے گا۔ اس تناظر میں راسخؔ کا یہ شعر محض تعلّی نہیں، خود شناسی کا مظہر ہے:۔

ہوں میں وہ گُہر گرد کی تہہ بیٹھی ہو جس پر آلودۂ کلفت مری روشن گُہری ہے

مثنوی نگاری

کلاسیکی اردو شاعری کی چار مقبول اصناف میں مثنوی نہایت اہم ہے۔ اس صنف میں بڑے امکانات ہیں۔ کسی بھی عہد میں لکھی جانے والی مثنویاں اس عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی مزاج و ماحول کی عکاس ہوتی ہیں۔ اردو میں مثنوی نگاری کی ایک وسیع اور زریں تاریخ ہے جس میں مختلف موضوع و مضامین پر لکھی ہوئی مثنویوں کی ایک کہکشاں ہے۔ راسخؔ عظیم آبادی نے بھی غزل کے علاوہ مثنوی نگاری پر خاص توجہ دی ہے اور چھوٹی بڑی انیس درج ذیل عنوان کی مثنویاں لکھی ہیں:۔

(۱) سبیل نجات (۲) کشش عشق (۳) نیرنگ محبت (۴) جذب عشق (۵) شرح حال
(۶) مثنوی عابد کہ دوز وجہ داشت (۷) حسن وعشق (۸) ناز و نیاز (۹) اعجاز عشق (۱۰) نورالانظار (۱۱) گنجینۂ حسن (۱۲) مرأت الجمال (۱۳) مکتوب الشوق (۱۴) مثنوی در بیان انقلاب زمانہ و شکایت فلک (۱۵) مثنوی مدحیہ (۱۶) حکایت در بیان احوال تاجر (۱۷) حکایت در بیان تاجر (۱۸) ایک اس شہر میں اپچّا ہے (۱۹) مثنوی در مدح جناب مولوی محمد راشد

ان میں کئی مثنویاں روایتی طرز کی ہیں۔ چند پند ونصیحت کی ترجمان ہیں۔ چند حسن و جمال کی

عکاس ہیں اور ایک شہر آشوب کی صورت میں ہے۔ معاملات عشق غزل اور مثنوی دونوں میں اہم رہے ہیں۔ اردو میں عشقیہ مثنویاں مقبول ہوتی رہی ہیں۔ ملا وجہی سے میر حسنؔ تک اس کا ایک خوشنما تسلسل ہے۔ راسخؔ نے بھی کئی عمدہ عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے ان کے مثنویوں کو موضوع کے لحاظ سے اس طرح الگ الگ کیا ہے:۔

☆ **عشقیہ مثنویاں**۔ کشش عشق، نیرنگ محبت، جذب عشق، حسن وعشق، ناز و نیاز، اعجاز عشق، گنجینۂ حسن، مرأت الجمال، مکتوب الشوق (کل نو عدد)

☆ **ماحول ومعاشرت پر مبنی مثنویاں**۔ شرح حال، مثنوی در بیان انقلاب زمانہ (دو عدد)

☆ **مدحیہ مثنویاں**۔ مثنوی مدحیہ، مثنوی مدح جناب مولوی محمد راشد (دو عدد)

☆ **پند وموعظت پر مبنی مثنویاں**۔ سبیل نجات، مثنوی عابد کہ دوز وجہ داشت، حکایت در بیان احوال تاجر، حکایت در بیان تاجر، ایک اس شہر میں اپچکا ہے، نورالانظار (کل چھ عدد)

اس موضوعاتی نشاندہی اور دائرہ بندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ راسخ کی مثنویوں میں موضوعاتی سطح پر بڑی بوقلمونی ہے۔ عشقیہ مثنویوں کی تعداد زیادہ ہے مگر ایسی مثنویاں بھی ہیں جن سے ان کے ذاتی ضابطۂ حیات کے ساتھ ساتھ اس دور کے تاریخی اور تہذیبی حالات کی ہلکی پھلکی جھلک ملتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے راسخؔ کی مثنوی نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

(الف) ''راسخؔ کی ۹ مثنویاں عشقیہ ہیں جن میں سے چھ مثنویات میرؔ کا چربہ ہیں۔ ان میں بلا کی یکسانی ہے۔ سب میں اول عاشق جان دیتا ہے پھر جذبۂ عشق سے محبوبہ بھی ہلاک ہو جاتی ہے اور بعد مرگ لاشوں کا وصال ہوتا ہے۔ ہر قصے میں عاشق اور معشوق کی لاش کو چسپاں کر دینے میں نہ کوئی ندرت رہ گئی ہے نہ لطف بلکہ شاعر کے تخیل کا افلاس ظاہر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں قدما کا شعور قصہ گوئی کتنا کمزور تھا کہ بار بار ایک ہی قسم کا واقعہ نظم کر دیتے تھے۔'' (17)

(ب) ''ان (راسخؔ) کی مثنویوں کی زبان میرؔ کی نسبت قدرے ثقیل ہے۔ عربی فارسی الفاظ کا استعمال کافی ہے۔ رومانی مثنویوں میں انقطاع، منقبض، جملگئ وفا، شعیرہ جیسے الفاظ لے آئے ہیں۔ مثنوی 'جذب عشق' کی زبان میرؔ

سے ملتی جلتی ہے۔اس مثنوی پر بالکل کلام میرؔ کا دھوکا ہوتا ہے۔''ناز و نیاز'' میں بھی میرؔ کا محاورہ ہے۔''(18)

اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ راسخؔ شروع ہی سے اسلوب میرؔ سے متاثر رہے ہیں اور مختلف سطحوں پر اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔مگر بعض معاملات میں وہ کچھ زیادہ روایت پرست ہیں۔ انہوں نے عموماً مثنوی کے عناصر ترکیبی کی پابندی کی ہے اور ابتدا حمد، نعت، منقبت اور مناجات وغیرہ سے کرتے ہیں جب کہ میرؔ ان پابندیوں سے اکثر آزاد نظر آتے ہیں۔

راسخؔ نے اپنی کئی مثنویوں میں لکھنؤ، بنارس، کلکتہ اور عظیم آباد کے ماحول، طرز زندگی اور تہذیب کی شاعرانہ تصویر کشی کی ہے۔مثنوی 'گنجینۂ حسن'، حمد، نعت اور منقبت سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد 'تمہید وصف شہر عظیم آباد' اس طرح پیش کرتی ہے:۔

جہان کہنہ تو اب تک نیا ہے   بہت دلکش ہے، کتنا خوش نما ہے
محل سیر ہیں اس اقلیم   ہوئی کن خوبیوں سے ان کی تقسیم
ہر اک اقلیم میں ہے نو بہ نو شہر   تعالیٰ اللہ زہے معمورۂ دہر
کہن سیارہ ہوں باغ جہاں کا   رہا ہوں میں نسیم اس گلستاں کا
کیا ہے سیر اس عالم کا گلشن   صبا کے باندھ کر دامن سے دامن
بہت تھا پیش ازیں شوق سیاحت   بہت در پیش آئے رنج و راحت
نظر مجھ کو پڑے ہیں جا بجا شہر   نہ دیکھا پر عظیم آباد سا شہر
نہ کہئے شہر اس کو ہے تماشا   نہ دیکھی حسن خیز ایسی کوئی جا
گلی کوچے سب اس کے وجہ تفریح   رکھے ہے مصر پر یہ شہر ترجیح
نہیں ہیں دلکشا تر باغ اس سے   گلستانِ ارم ہے داغ اس سے

اسی طرح مثنوی 'مرأت الجمال' میں کلکتہ کی ملفوظی تصویر یوں کھینچتے ہیں:۔

پھرا مدتوں میں سراپائے دہر   نہ دیکھا پہ کلکتہ سا کوئی شہر
نہیں حسن خیز ایسی کوئی زمیں   کہاں خوبصورت ہیں اتنی کہیں
پری رو ہیں یاں ہر طرف جلوہ گر   کہے تو پرستاں ہے سر بہ سر

عجب ایک سیر اس دن رات ہے   گلی جو ہے اس کی طلسمات ہے

اپنی دوسری مثنوی 'حسن وعشق' میں راسخؔ شہر کلکتہ کا زیادہ واضح نقشہ پیش کرتے ہیں:۔

آباد ہیں ان سے یوں تو سب شہر   لیکن کلکتہ ہے عجب شہر
بے شبہ ہے غیرت ولایت   وسعت اس کی ہے بے نہایت
کب ہوسکیں اس کے وصف ترقیم   ہر کوچہ ہے رشک ہفت اقلیم
سر تا سر شہر ہے طلسمات   اعجوبہ ہے اک کیا کہوں بات
یہ شہر انہیں بہت خوش آیا   حد سے افزوں اسے بسایا
اک اک قدم پر اس میں گھر ہے   یاں کثرت خلق کس قدر ہے
تنگی کرتی ہے ساری پرجا   رہتا ہے ہجوم مردم ایسا

وہ صرف کلکتہ کے گلی کوچوں اور گنجان آبادی کا تذکرہ ہی نہیں کرتے بلکہ وہاں کی تعلیم گاہوں پر بھی نظر رکھتے ہیں:۔

تعمیر کیا ہے مدرسا ایک   ہے مدرسہ جاری دلکشا ایک
فاضل ذی رتبہ مردِ ہشیار   اس مدرسہ سے کیا ہے مختار
نام اس مختار کا امیں ہے   وہ چہ رواج علم دیں ہے
ارفع اس کا ہے پایۂ علم   کس پاس ہے ایسا پایۂ علم
فخر علمائے ہر زماں ہے   وہ علم کا بحر بیکراں ہے

راسخؔ مدرسہ عالیہ کی طرح فورٹ ولیم کالج کی بھی تعریف میں رطب اللسان ہیں:۔

کالج نہیں جائے فیض ہے وہ   اک طرفہ بنائے فیض ہے وہ
ہر علم کا درس واں ہے جاری   ذی علم ہی کی ہے خواستگاری

راسخؔ ہر شہر پر کلکتہ کی طرح گہری نظر نہیں ڈالتے ہیں۔اتنا ضرور ہے کہ وہ ہر شہر کی چمک دمک اور رونق سے متاثر ہوتے ہیں اور وہاں کی حسینان سے بھی۔مثنوی 'کشش عشق' میں بنارس کا ہوش ربا منظر اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

زہے شہر محسود باغ بہشت   زن و مرد سب حور و غلماں سرشت

مئے خالص حسن دلکش سے مست
جفا پیشہ و سنگ دل بت پرست

انہوں کے رخِ خوب ماہ تمام
کرے صبح عاشق کو زلف ان کی شام

ڈھب ان کی نگاہوں کا ایماں فریب
بھنویں کافر ان کے مسلماں فریب

جسے دیکھو وہ فتنۂ روزگار
جہاں جاؤ واں اک بلار و نگار

اسی جائے رہئے یہ چاہے نظر
پھرے چشم جس گوشۂ بام پر

لب آب جاوے اگر کوئی واں
تو دیکھے عجب طرح کا اک سماں

راسخ نے مختلف مثنویوں میں اپنے ذوقِ جمال اور حسن پرستی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ عموماً محتاط رہتے ہیں مگر مثنوی 'گنجینۂ حسن' میں راسخ کا بالکل بدلا ہوا انداز بیان بھی ملتا ہے۔ تمہید وصف محبوبہ، صفت سراپائے محبوبۂ رنگین ادا، وصف جبین، وصف چشم وابرو، وصف نگاہ وطرز نگاہ، وصف بنی وگوش، وصف لب، وصف تکلم وتبسم، وصف جوبن، وصف قطعہ رخ، وصفِ رخسار، وصف مو، وصفِ دست حنائی، وصفِ سینہ، وصفِ ناف، وصف کمر، وصفِ کف پا، وصفِ قد وقامت غرض مادی محبوب کے حسن وجمال اور وجود بے مثال کی سحر طرازیوں کے سارے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

نگہ ان کی تو تیر بے صدا ہے
نگہ کی طرز آفت ہے بلا ہے

بندھے ہیں دل نظر کے تار کے ساتھ
غضب ہے دیکھ رہنا پیار کے ساتھ

لب اس کے آتشِ خاموش گویا
جہاں میں ہر طرف ہے شور ان کا

مسیحا یاد میں دن رات ان کی
عجب لب ہیں، غرض کیا بات ان کی

شکم رشک رخ نورانی صبح
خجل ہے اس سے نور افشانی صبح

ہے اس کی ناف خوش ترکیب یاں تک
کہ جس کی چشم آہو پر ہے چشمک

آگے دوسرے اعضائے محبوب کا بھی ذکر ہے اور ان کے متعلق جو الفاظ استعمال کئے ہیں، جس زاویے سے اظہار کیا ہے، اس سے راسخ کے جنسی اور شہوانی جذبات عیاں ہوتے ہیں۔

راسخ نے ایک منفرد مثنوی 'انقلاب زمانہ' بھی لکھی ہے جو دراصل شہر آشوب ہے۔ میرؔ، سوداؔ اور دوسرے شاعروں نے بھی 'شہر آشوب' لکھے ہیں جن میں دہلی اور لکھنؤ کی سیاسی اور سماجی بساط الٹنے اور

برباد ہونے کی المناک روداد ملتی ہے۔ ان کے 'شہر آشوب' سے تاریخ کے بے شمار حقائق سامنے آتے ہیں۔ اس دور کے عظیم آباد کے انحطاط پر کسی قلمکار نے توجہ نہیں دی۔ راسخ نے پہلی بار عظیم آباد کی عظمت رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے وہاں ہونے والی سماجی، معاشی اور تہذیبی کایا پلٹ پر روشنی ڈالی ہے۔ سیاسی تنزلی کے بعد وہاں کے امراء، شرفا، اہل صنعت وحرفت، تاجر، طبیب، صوفیا، اساتذہ، سپاہ پیشہ غرض سب ہی بدحال اور بے روزگار ہو رہے تھے اور فاقہ کشی کی نوبت آ گئی تھی۔ اس مثنوی کو اٹھارہویں صدی کے عظیم آباد کا ایک اہم تاریخی ماخذ کہا جا سکتا ہے۔ چند منتخب شعر دیکھئے:۔

یہ گلزار اب ہوگیا خارزار
خزاں ہوگئی ہائے اس کی بہار

حسد، بغض ہے کینہ ہے یا نفاق
کہ وہ دوستی ہے نہ وہ اتفاق

کوئی اس چمن میں تونگر نہیں
کوئی غنچہ ساں صاحب زر نہیں

جو تھے صاحبِ صد کنیز و غلام
وے اپنے تئیں بیچتے ہیں مدام

جو قصر اور ایواں سے تھے بہرہ ور
ہے اب خانۂ عنکبوت ان کا گھر

مشائخ جو ذی عز و تعظیم ہیں
دل ان کے بھی صدمہ کشِ بیم ہیں

لکھوں خوش نویسوں کا میں حال کیا
نوشتہ پر اپنے ہیں گریاں سدا

معلم ہوا ناظمِ وقت اگر
کوئی پوچھتا ہی نہیں اُس کو پر

وکالت کا بازار بھی سرد ہے
وکیل اب جو ہے وہ بڑا مرد ہے

کہاں اب وکالت کو رونق پذیر
موکل ہی سب ہوگئے ہیں فقیر

تجارت کا مایا کسو میں کہاں
کہ باقی نہیں کچھ بجز نقد جاں

طبابت میں بھی کچھ نہیں اب حصول
اطبا ہیں اس عہد میں سب ملول

ایک طویل مثنوی 'نور الانظار' ہے۔ یہ ڈاکٹر ممتاز احمد کی کتاب 'مثنویات راسخ' میں چونسٹھ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی ابتدا حمد باری تعالیٰ اور نعت سے ہوتی ہے۔ اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کی شان کریمی اور اس کی عبادت اور بندگی کی اہمیت وعظمت ہے۔ راسخ نے اپنے صوفیانہ اور اخلاقی خیالات کی بڑی موثر ترجمانی کی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے چند شعر ملاحظہ ہو:

عیب پوشی:

عیب پوشی تو ہے اک طرفہ ہنر منزلت اس کی بہت ہے بہتر

رونق کار ہنر مند ہے یہ عمل خاص خداوند ہے یہ

عیب پوشی ہے شعار عرفا عیب پوشی ہی ہے کار عرفا

ادب وتہذیب:

کارِ اربابِ ارادت ہے ادب شیوهٔ اہل سعادت ہے ادب

مجلس قرب میں ان کو ہے قیام اس ادب کا جنہیں حاصل ہے مقام

ہوتے ہیں اس سے فتوحات پدید ہے ادب باب مطالب کی کلید

ہیں سعید ازلی اہل ادب بےادب جتنے ہیں مغضوب ہیں سب

بندگی:

عبد کا ہے کو ہے وہ شخص فضول یعنی بندہ وہ ہے جو تھا مقبول

رہا ہر آن فدائے مولا رہا مصروفِ رضائے مولا

طابع امر خداوند ہوا اپنی خواہش کا نہ پابند ہوا

اس مثنوی میں راسخؔ کے پاکیزہ جذبات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ وہ معراج، انبیا کرام وغیرہ کے واقعات اور مختلف حکایتوں کے حوالے سے اپنے مذہبی افکار کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا اختتام بھی پند اور نصیحت کے ساتھ ہوا ہے:۔

کم ہے فرصت بہت اب دیر نہ کر عذر تقصیر میں تقصیر نہ کر

مرنے میں عذر کے کاہل تو ہے ورنہ رحمت تو بہانہ جو ہے

تا کجا غیبت اسے کہتے ہیں کیا اب بھی اے بندہ بگریختہ آ

گو گنہگار ہے پرمت کر بیم اب بھی جا خیر ہو کہ صاحب ہے کریم

راسخؔ نے طرح طرح کے موضوعات پر مثنویاں لکھی ہیں اور ان میں موضوع و مواد کی پیش کش کا انداز بھی الگ الگ ہے اور اسی لحاظ سے اسلوب تراشا ہے۔ وہ عربی اور فارسی پر اچھی دسترس رکھتے تھے اس لیے بسا اوقات ان زبانوں کے ایسے ثقیل اور اجنبی الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں جو اردو شاعری میں

رائج نہیں رہے ہیں۔ ان کے ہمعصروں نے بھی استعمال نہیں کیے ہیں۔

جہاں تک فن مثنوی نگاری کا تعلق ہے، ڈاکٹر ممتاز احمد نے میرؔ اور راسخؔ کی مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

”میرؔ نے اپنی مثنویوں میں تکنیک کا زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔ یہ عموماً عشق کی تعریف سے اپنی مثنوی شروع کرتے ہیں اور اس کے بعد واقعہ بیان کرتے ہیں لیکن راسخؔ کے یہاں یہ بات نہیں۔ راسخؔ کی مثنویاں عموماً حمد، نعت، منقبت، مناجات سے شروع ہوتی ہیں۔ مثنویوں کے اصول مسلمہ راسخؔ کے یہاں ہیں لیکن میرؔ کے نہیں۔ ان کے برتنے کے علاوہ راسخؔ نے قصیدے کے 'وصف ممدوح' اور 'وصف سخاوت' وغیرہ چیزوں سے بھی اردو مثنویوں کو روشناس کیا، ان چیزوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے لیکن ان سے مثنوی کی تکنیک کو مرکب بنا کر اس میں اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح راسخؔ کے یہاں 'سخن' پر جو بصیرت افروز تبصرے ملتے ہیں، میرؔ کے یہاں ان کا سرے سے پتہ نہیں۔“(19)

ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے ان کی مثنویوں کا جائزہ قدرے منفی انداز سے لیا ہے:۔

”راسخؔ عظیم آبادی کی ان مثنویوں میں واقعات، قصص روایتی ڈھنگ کے ہیں۔ ان میں دلچسپی کا کوئی خاص پہلو نظر نہیں آتا۔ مثنویوں کے کرداروں کی پیکر تراشی اور سیرت نگاری بھی نہایت خام اور کمزور ہے۔ واقعاتی ترتیب و تسلسل کو بھی فطری انداز میں قائم نہیں رکھا جا سکا ہے۔“(20)

یہ درست ہے کہ راسخؔ نے اپنی اکثر مثنویوں میں فن کا خیال نہیں رکھا ہے اور ابتدا میں یا درمیان میں بعض ایسے غیر ضروری اور غیر متعلق ٹکڑے جوڑ دیئے ہیں، جن کا کوئی تعلق اصل قصے سے نہیں ہے۔ غالباً اسی لیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے راسخؔ کی دو مثنویوں 'نیرنگ محبت' اور 'حسن و عشق' کے حوالے سے لکھا ہے:۔

”راسخؔ کی عشقیہ مثنویوں کی یہ ایک عام کمزوری ہے کہ وہ اصل کی نسبت فرع

پر کہیں زیادہ زورِ طبع صرف کرتے ہیں۔'' (21)

وہ مثنوی 'کشش عشق'' کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''اس مثنوی میں بھی طویل تمہید کا اثر حکایت پر برا پڑتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ مثنوی کے دونوں حصوں میں کوئی ربط و توازن نہیں بلکہ قصے پر بھی پوری توجہ نہیں کی گئی اور تمہیدی اشعار کے انبار میں قصے کی انفرادی حیثیت دب کر رہ گئی ہے۔'' (22)

راسخ کی مثنوی نگاری کا کوئی محاکمہ ان کی ہجویہ مثنویوں کے تجزیے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ انہوں نے چار ہجویہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ان چاروں ہجویہ مثنویوں میں 'عابد کہ دوز وجہ داشت' میں ایک ہلکا پھلکا مختصر واقعہ گڑھا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بیویوں کے نزدیک عابد بھی گمراہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اپنی داڑھی بھی گنوا بیٹھتا ہے۔ اسی طرح 'حکایت در بیان احوال تاجر' میں بھی تاجر کی دو بیویوں کے نسوانی جذبات اور فطری خواہشات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ ان ہجویہ مثنویوں میں راسخ نے نہ واقعہ میں دلچسپی کا خیال رکھا ہے اور نہ شگفتگیِ اسلوب پر توجہ دی ہے بس اصلاح معاشرہ کے لیے چند بنیادی باتیں پیش کی ہیں۔ غالباً وہ عورتوں کی خود غرضانہ ذہنیت سے بھی نالاں تھے۔ علاوہ ازیں کثرت ازدواج پسند نہیں کرتے تھے۔ ان مثنویوں میں یہی مطمح نظر واضح کرتے نظر آتے ہیں۔

نصیحت آمیز مثنویوں میں 'ایک اس شہر میں اچکّا ہے' کسی قدر بہتر ہے اور مزے لے کر پڑھنے کے لائق ہے۔ اس طرح کے موضوع پر بہت کم مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ بائیس شعروں پر مشتمل اس مختصر مثنوی میں راسخ نے عصری سماج کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی ہے۔ اچکّے کی عادت اور مہارت کا بیان اس طرح کیا ہے:۔

ایک اس شہر میں اچکّا ہے   دست بردی کے فن میں پکّا ہے
کہیں اس کو امیر چوروں کا   ہے وہ بے پیر، پیر چوروں کا
چور کیا چومے ہیں ٹھگ اس کا پاؤں   ٹھگنے لیں گے پہلے اس کا ناؤں
حد سے افزوں ہے اس میں بے باکی   کیا کہوں اس کی دست چالاکی
جب وہ چوری کی گھات میں لاگے   گھر ہی سر پر اٹھا کے لے بھاگے

جون سی شئے خطر چڑھا جاوے   دیکھتے دیکھتے اڑا جاوے
شعبدہ باز ہے کہ جادو گر   جائے حیرت ہیں اس کے کام اکثر

راسخ کی کم و بیش ساری مثنویاں اپنے ابتدائی مواد اور اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے مثنوی نگاری کی فارسی روایت سے قریب ہیں۔ ان میں جہاں کوئی قصہ، حکایت یا واقعہ نظم ہوا ہے وہاں مثنوی نگاری کو ایک الگ جہت دی گئی ہے۔ کئی مثنویوں میں سماج کے عام واقعات، ماحول اور عام کردار، ان کی شخصیت و سیرت اور سراپا پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ کہیں کہیں واقعات کے بیان میں انہوں نے عموماً بالکل غیر ضروری اور طویل تمہید شامل کر دی ہے۔ کسی کسی جگہ تکرار خیال سے ان کی قادر الکلامی تو ثابت ہو جاتی ہے مگر واقعے یا قصے کا ارتقا متاثر ہوتا ہے۔ بعض مثنویاں میر کی تقلید میں لکھی ہیں مگر اپنے دوسرے معروف پیش رو میر حسن کی مثنویوں پر بالکل توجہ نہیں دی ہے۔ میر حسن نے جس طرز پر اپنی لافانی عشقیہ مثنوی 'سحر البیان' لکھی اور اس میں ماحول، تہذیب و ثقافت کی تصویر کشی کی۔ متحرک، زندہ اور یادگار کردار تخلیق کئے۔ یا جس طرح 'گلزار ارم' میں اپنے شخصی حالات اور عصری و معاشرتی حقائق پیش کئے ہیں۔ اگر راسخ میر حسن کی مثنویوں کے ان اوصاف سے استفادہ کرتے تو ان کی مثنویوں کی ادبی اور فنی حیثیت میں اضافہ ہوتا۔

قصیدہ نگاری

اردو میں قصیدے کی صنف فارسی و عربی سے آئی ہے مگر اس کے موضوعات میں تنوع، اسلوب میں شان و شکوہ اور اجزا کا تعین مختلف دور میں ہوا ہے۔ قصیدوں میں جہاں حمد، نعت اور منقبت کی صورت میں رب کریم، حضورؐ اور صحابہ و اولیا کی تعریف و توصیف کی گئی ہے وہاں ان سلاطین، نوابین اور امرا کی بھی مدح سرائی ہوئی ہے جنہوں نے بڑی فیاضی سے اہل فن اور عوام الناس کی سرپرستی کی۔ راسخ عظیم آبادی نے مختلف نوعیت کے قصیدے لکھے ہیں۔ ان کے دیوان کا آغاز حضور سید المرسلینؐ کے قصیدے سے ہوتا ہے۔ اس کا مطلع ہے:۔

اعتدال افسوس گردوں کی طبیعت میں نہیں   بس کہ ہے تغیر اس کو گہہ چناں گاہے چنیں

اس میں انسٹھ شعر ہیں (23) انیس شعر کے بعد مطلع ثانی ہے:۔

خلق عالم کا نہیں تیرے سوا کوئی معیں   رحم کر عالم پہ اب یا رحمۃ اللعالمیں

اس نعتیہ قصیدے کے بعد ایک قصیدہ در منقبت حضرت علیؓ ہے۔ کئی قصائد اور مدحیہ قطعات درج کرنے کے بعد ردیف وار غزلیں درج ہیں۔ ہر چند راسخؔ نے امرا کے درباروں سے دور رہنے کی کوشش کی اور یہ بھی علی الاعلان کہا:۔

راسخؔ کے بادشاہوں کو دیکھا نہ آنکھ اٹھا   کیا وہ گدا بھی صاحبِ طبعِ غیور تھا

یہ درست ہے کہ وہ حتی الامکان اپنا دامن بچاتے رہے تاہم مالی بدحالی سے مجبور ہو کر انہوں نے آٹھ قصیدے لکھے۔ مدحیہ قطعات، رباعیاں اور مثنویاں لکھیں۔ کرم فرماؤں، فورٹ ولیم کالج کے منشیوں، انگریز حاکموں، اہل ثروت اور نوابوں کے ذہن و دل پر شاعری کے توسط سے دستک دی۔ لکھنؤ میں قیام کیا تو وہاں نواب آصف الدولہ اور نواب غازی الدین حیدر کے قصیدے لکھے مگر ان دونوں کی مدح میں انہوں نے روایتی انداز نہیں اپنایا۔ دونوں طویل قصیدے بالترتیب مثنوی 'کشش عشق' اور 'حسن و عشق' میں سمائے ہوئے ہیں۔ ہر چند دونوں قصیدوں میں ان کا صنفی رنگ روپ کسی حد تک نمایاں ہے، مثنویوں میں ضم ہونے کے سبب ان کی انفرادی حیثیت کم ہوگئی ہے۔ قصیدۂ نواب آصف الدولہ کے یہ شعر دیکھئے:۔

بلندی پہ کچھ تیرے پائے میں ہے   بلند آسماں جس کے سایہ میں ہے
گدا ہیں امیر آستاں کے ترے   دعا گو ہیں سب خانداں کے ترے
بہت خلق کو تجھ سے آرام ہے   رعیت نوازی ترا کام ہے
کریں ہیں سب آرام سے زندگی   کٹے ہے مے و جام سے زندگی
فقط ہے یہ تیرا ہی یمن قدم   ہوا لکھنو تیرے باعث ارم

قصیدے میں خیال اور مضمون تسلسل کے ساتھ بیان ہوتا ہے اس لیے بیچ بیچ میں عنوان بھی لگا دیتے ہیں جیسے سوداؔ کے بعض قصیدوں میں در منقبت حضرت علیؓ، در مدح عالمگیر ثانی یا در مدح نواب آصف الدولہ وغیرہ۔ راسخؔ نے بھی اس قصیدے میں شہر لکھنو کی صفائی، بازار، عمارتوں اور مکان ممدوح، وصف ہمت، شجاعت، شمشیر، اسپ، فیل، شکار، تیراندازی، عدل وغیرہ جیسے عنوانات لگائے ہیں اور بیسیوں شعر اور قطعات کہہ ڈالے ہیں۔ وہ مسجد اور امام باڑہ پر بھی کئی شعر کہتے چلے جاتے ہیں اور اپنی قادرالکلامی کے مظاہرے میں قصیدے کے موضوعاتی دائرے سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے ہیں۔

مثنوی 'حسن و عشق' میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد 'وصف سخن' اور 'شکوہ فلک جفا شعار' کے

ضمن میں بیسیوں اشعار اور کئی قطعات لکھتے ہیں پھر نواب غازی الدین حیدر خاں کی مدح پر راغب ہوتے ہیں:۔

اے خامہ کر اس کی مدح تحریر   جس کے در کی ہے خاک کسیر
جوں مہر ہے فیض عام اس کا   ہے ذرہ نوازی کام اس کا
ہمت کے ہے سپہر کا ماہ   غازی الدین حیدر آسماں جاہ
ہم اس کی خرابیوں سے تھے داغ   ویرانہ سا بن گیا تھا یہ باغ
تاراجِ خزاں یہ باغ تھا ہائے   بجھتا چراغ کو دیا نور
کی ظلمت ظلم ظالماں دفع   پہنچائی گئی ہر ایک کو نفع
روشن کی شمعِ عدل ایسی   یکبارگی روشنی سے جس کی
روشن ہوا ملک ہند سارا   تاریکیوں نے کیا کنارا
نظم و نسق ان کا کیا بیاں ہو   مجھ سے ان کی صفت کہاں ہو
معمور ہے ان کے فیض سے دہر   تسخیر کیا انہوں نے جو شہر
اس شہر سے فتنے کو نکالا   رونق اس کی ہوئی دوبالا

بعد میں راسخؔ نے منقولہ بالا قصیدے کے اس حصے میں قدرے تبدیلی کر کے ''مدح صاحبان عالی شان کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہٗ'' بنا دیا۔ تبدیل شدہ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

اے خامہ کر ان کی مدح تحریر   ہے خاک جنہوں کے در کی اکسیر
عالم میں ہے فیض عام ان کا   ہے فیض رسانی کام ان کا
وے کون یہی بلند خرگاہ   انگریز بہادر آسماں جاہ
ہم عزم انہوں کا کیا کریں نقل   یہ صاحب ہوش جملہ تنِ عقل
یوں ہند میں ایک بار آئے   گلشن میں جوں بہار آئے
ویرانی ہند پہنچی تھی دور   تھا گرچہ بہت یہ شہر معمور
آباد کیا اسے شتابی   خوبی سے بدل ہوئی خرابی

وہ کسی قدر خوشامدانہ انداز میں بنگال کے گورنر جنرل لارڈ منٹو کی تعریف و توصیف بھی کرتے نظر آتے ہیں:۔

اس شہر میں ہے جو اب گورنر　　عادل ہے اور داد گستر
سب ذرہ ہیں آفتاب ہے وہ　　یعنی عالی جناب ہے وہ
اس کا ہمسر کوئی کہاں ہے　　یہ سب ہیں زمیں، وہ آسماں ہے
ہے عدل مدام کام اس کا　　لارڈ منٹو ہے نام اس کا
دانائی میں عقل اولیں ہے　　ایسا عاقل کہیں نہیں ہے
فرماں وہ کشور فراست　　زیبا اسے کرسئ ریاست

انہوں نے لکھنؤ کے دونوں نواب یا انگریزوں کی جو تعریف و تحسین کی اور اپنے معاشی مسئلے کا اطمینان بخش حل نکالنا چاہا لیکن کامیابی نہیں مل سکی اور مالی بدحالی برقرار رہی۔

ایک باقاعدہ قصیدہ انہوں نے درمدح نواب شمس الدولہ بہادر لکھا ہے تاہم اس میں بھی قصیدے کے اجزائے ترکیبی کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اس کی ابتدا ایک واقعے سے ہوتی ہے:۔

اتفاقاً میں رہا رات جو اک دوست کے گھر　　طرفہ صحبت رہی لے شام سے تا وقت سحر
گہہ بزرگانِ سلف کی رہیں باتیں کچھ کچھ　　گہہ رہا قصۂ شاہانِ رعیت پرور
دیر تک ذکر امیروں کا رہا پروے امیر　　قدرداں اہلِ ہنر کے تھے جنہوں میں اکثر
یاد آئی جو مجھے رتبہ شناسی ان کی　　آنکھیں بھر آئیں مری یوں کہا میں نے رو کر
کہ صد افسوس ممیّز تھے بد و نیک کے جو　　اک انہوں میں سے نہیں اب گئے وے لوگ کدھر
دفعتاً اٹھ گئے بازار جہاں سے اے وائے　　وے جواہر کے پرکھنے کی جو رکھتے تھے نظر
کب خذف ریزۂ بے قدر کو کہتے تھے لعل　　پوتھ کو پوتھ سمجھتے تھے گُہر کو گُہر

راسخ تاریخِ پارینہ کا ذکر کرتے ہوئے نواب شمس الدولہ بہادر کی مدح پر مائل ہوتے ہیں۔ مطلع ثانی سے اصل مدح شروع ہوتی ہے:۔

بس کہ تو خلقِ خدا کا ہے معین و یاور　　مہرباں کیوں کہ نہ تجھ پر ہو خدائے اکبر
عقدے دل کے ترے وا کیوں نہ ہوں تو نے دل سے　　باندھی ہے عقدہ کشائی پہ غریبوں کی کمر
چین سے کیوں نہ تری گذرے کہ تیرے باعث　　غربا کرتے ہیں آرام سے عمر اپنی بسر
فطر بخشش کا تری وصف بیاں کیا ہو کہ ہے　　روحِ حاتم کے تئیں اس پہ حسد آٹھ پہر

بخش دے ایک گدا کے تئیں تو وہ ہے کریم　　ہفت اقلیم تصرف میں ترے ہووے اگر
اس کے رکھنے کو جگہ کی انہیں رہتی ہے تلاش　　اس قدر بخشے ہے محتاجوں کو تو سیم و زر

انہوں نے 'قصیدہ درمدح نواب خاں جہاں خان بہادر' میں بھی یہی تکنیک اپنائی ہے۔ یہ قصیدہ بھی ایک واقعہ سے اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

کل ایک شخص ہوا مجھ حزیں سے رہ میں دوچار　　ملال کے مرے چہرے پہ دیکھ کر آثار
کہا یہ مجھ سے کہ وا کر دل گرفتہ کو　　شگفتہ ہو گل گلزار کی روش اے یار
برنگ غنچہ ترا دل رکا ہوا ہے کیوں　　سبب گرفتگیِ طبع کا کر اب اظہار
یہ سن کر اس سے کہا میں نے بے دماغانہ　　مری گرفتگیِ دل سے کیا تجھے سروکار
دیا جواب کہ رنجیدہ اس قدر مت ہو　　غم اپنا مجھ سے بیاں کر کہ ہوں ترا غم خوار

اس قصیدے میں بھی وہ 'مطلع ثانی' سے ممدوح کی توصیف شروع کرتے ہیں:۔

صفت کروں تری کس طرح اے نکو کردار　　کہ مور وصف سلیماں نہ کر سکے زنہار
تو آفتاب سپہر شکوہ و حشمت ہے　　میں ایک ذرۂ ناچیز اور بے مقدار
صفا کو ہے تری طینت سے ایسی آمیزش　　کہ دشمنوں سے بھی دل میں نہیں ہے تیرے غبار
صفت ہو کیا ترے افراط جود کی مجھ سے　　نہ کفش پا میں تھی جن کے نہ سر پہ تھی دستار
کیا غنی انہیں بخشش نے اب تری یاں تک　　کہ سیم و زر کا گھروں میں انہوں کے ہے انبار

راسخ کے قصیدوں کا یہ انداز اردو قصیدہ نگاری کی روایت سے لگا نہیں کھاتا ہے۔ غالباً اسی لیے ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے اس طرح کی رائے قائم کی ہے:۔

''راسخ قصیدہ نگار کی حیثیت سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے۔ اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ اس صنف سخن کو انہوں نے ضمناً برتا ہے۔ شاید اسی لئے قصیدے کے فنی و اسلوبی تقاضوں کی تکمیل پر انہوں نے توجہ نہیں دی۔ ورنہ اسی دور میں سودا جیسا عظیم الشان قصیدہ نگار بھی موجود تھا۔''(24)

راسخ نے اپنے پیش رووں۔ میر، سودا اور درد کا یقیناً بالاستعاب مطالعہ کیا تھا۔ اس کا ثبوت ان کی ابتدائی غزلوں میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی تخلیقات کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طبعاً غزل اور

مثنوی کی صنفوں سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے اور دوسری اصناف کی طرح قصیدے بھی رسمی طور پر یا مجبوراً لکھے ہیں مگر اصل سوال یہ ہے کہ انہوں نے سوداؔ کے بے مثال قصیدوں سے استفادہ یا تتبع کیوں نہیں کیا۔ اس کا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر قصیدے میں مثنوی کے بعض اجزا سمونے کی کوشش کی یا صنف قصیدہ میں مثنوی کے چند اجزا کی شمولیت سے ایک طرح کی ندرت پیدا کی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے راسخؔ کے قصیدوں کو محض رسمی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قصیدوں کی تعداد کم ہونے کے باوجود ان کی منفرد نوعیت انہیں ہیئتی تجربے کے زمرے میں شامل کرتی ہے۔

مرثیہ نگاری

مشرقی ادبیات بالخصوص عربی میں رثائی شاعری کی قدیم روایت ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی کئی شاعروں نے پراثر شخصی مرثیے لکھے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ واقعہ کربلا کے بعد عربی و فارسی میں اس صنف کو نئی جہت ملی۔ حق اور باطل کا خوں چکاں المیہ مرکزی حیثیت اختیار کر گیا اور ہر حق پرست مومن کی اس سے فطری طور پر جذباتی اور روحانی وابستگی ہوگئی۔ شاعری میں مرثیہ کے معنی اور تناظر کا علیحدہ تعین ہوگیا۔ امام الشہدا حضرت حسینؓ جدوجہد حق اور ایثار و قربانی کی زندہ مثال اور علامت بنے۔ دوسرے صوفی شاعروں کی طرح راسخؔ نے بھی اپنے مشرب کی ترجمانی مرثیوں میں کی اور چار مرثیے لکھے۔ ان کے دیوان میں درج پہلا مرثیہ حضرت امام حسینؓ کا ہے۔ اس میں چودہ بند ہیں اور ہر بند مسدس کی ہیئت میں ہے۔ پہلا بند دیکھئے:۔

آہ دسویں دن محرم کے یہ کشت و خوں ہوا　　　تختۂ داران ارض مار یہ گلگوں ہوا

کیوں نہ ہو بے آب جب ایسا دُرِ مکنوں ہوا　　　جس کی بے آبی سے سالار رسُل محزوں ہوا

جذب کی طاقت عطا ہوئی کربلا کی خاک کو

ورنہ جوش خوں ڈباتا کشتی افلاک کو

حضرت امام حسینؓ کو شہید کر دینے کے بعد باطل پرستوں نے ان کے سر مبارک کی جس طرح بے حرمتی کی، راسخ نے اس اذیت ناک واقعے کا بیان یوں کیا ہے:۔

ہائے بعد قتل اسے پھر امتحاں درپیش تھا　　　سر کو اس کے صدمۂ نوک سناں درپیش تھا

جابجا سرگشتگی نقل مکاں درپیش تھا　　　جانا اس صورت سے پیش دشمناں درپیش تھا

دوستی کا حق ادا کر نقد جاں وہ دے گیا

راستی یہ ہے کہ دادِ امتحاں وہ دے گیا

دوسرا مرثیہ حضرت امام حسینؓ کے بڑے صاحبزادے اور جوان سال مجاہد حضرت علی اکبرؓ کا ہے۔ اس میں اکتیس بند ہیں۔ پہلے بند میں حضرت علی اکبرؓ کی سیرت اور جذبۂ شہادت کا ذکر بڑے دلخراش انداز میں کیا ہے۔ وہ اپنی والدہ محترمہ سے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے پختہ ارادے کا اظہار کرتے ہیں:۔

جب حضرت اکبرؓ کو پیغام قضا آیا　　　خوش ہوگئے دل اپنا راضی بہ رضا پایا

مرنے پہ کمر باندھی، زین اسپ پہ بندھوایا　　　ماں نے کہا اے بیٹا کیا قصد ہے، فرمایا

دھن ہے مجھ اب اپنے اس سر کے کٹانے کی

رخصت دو بس اب مجھ کو میدان میں جانے کی

اس مرثیے میں راسخؔ نے بڑے دردناک مکالمے بھی نظم کئے ہیں نیز نسائی نفسیات کے مطابق حضرت علی اکبرؓ کی والدہ کے جذبات کی پرسوز ترجمانی بھی کی ہے:۔

بیتابی پہ کر میری ٹک دھیان علی اکبر　　　رخصت نہ ہو میں تیرے قربان علی اکبر

میدان کامت کر تو سامان علی اکبر　　　اب مان کہا میرا اے جان علی اکبر

جس دم تو چلا منہ پر خاک اپنے ملوں گی میں

گھوڑے کے ترے پیچھے سر ننگے چلوں گی میں

تو ہے وہ شجر جس کو میں دل میں لگایا ہے　　　اور شیرۂ جاں اپنا دے دے کے بڑھایا ہے

تجھ کو نظر بد سے کس کس کی چھپایا ہے　　　دن پھولنے پھلنے کا تیرے تو اب آیا ہے

صد حیف شجر میرا یوں تیغ سے کٹ جاوے

چھاتی مری اے پیارے کس طرح نہ پھٹ جاوے

تیسرا مرثیہ بھی حضرت امام حسینؓ کا ہے۔ تیس بند پر مشتمل اس مرثیے میں راسخؔ نے شب عاشورہ کی ہولناکی کے حوالے سے جذباتی منظرکشی کی گنجائش نکالی ہے اور صبح عاشورہ کی المناکی کے پیش نظر اپنے پاکیزہ اور معصوم جذبات کی ترجمانی کی ہے:۔

تو اے سپہر سحر کرنا بھول جاوے کاش　　نہ وقت صبح کبھو تجھ کو یاد آوے کاش
سماں ہمیشہ تجھے شام ہی کا بھاوے کاش　　مجھے تو ہجر کا ظالم نہ دن دکھاوے کاش
طلوع صبح قیامت تلک نہ ہو خورشید
بر آوے کاش یہ مجھے ناامید کی امید

یہ زلف شب رہے بکھری روئے دو عالم پر　　نہ ہو کہ لگ چلے اس سے کبھو نسیم سحر
جھلک کسو کو رخِ مہر کی نہ آوے نظر　　رہے جہان سیہ پوش تا دمِ محشر
سیاہی شب کی نہ تبدیل ہو سفیدی سے
مری امید بدل ہو نہ ناامیدی سے

اس مرثیے میں رزم کی سرسری منظر نگاری بھی ہے اور بعض اجزائے مرثیہ ـــ رخصت، رزم، شہادت اور بین کے اشعار بھی ہیں۔ دیکھئے یہ رزمیہ بند جس میں حضرت امام حسینؓ بڑے صبر و تحمل اور ثابت قدمی سے اعدائے اسلام کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کرتے ہیں:۔

اٹھائے تیغ کے حملے بہت ہی خوش ہوکر　　ہر ایک زخم پہ تھی اک شگفتگی دگر
لگی جو برچھی تو بولا کہ اس سے کیا بہتر　　گرا زمیں پہ تو پہنچا وہ عرش کے اوپر
تن نزار سے ہر چند سر کا فصل ہوا
ولے یہ فصل عجب تھا کہ وجہ وصل ہوا

چوتھا مرثیہ 'واقعہ' کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں ماہ محرم کی آمد اور اس کی اندوہ ناکی، حضرت امام حسین کی ثابت قدمی، حضرت عباسؓ کے مشکیزے پر تیروں کی بوچھار اور حضرت علی اکبرؓ کی دل خراش شہادت کا واقعہ اختصار سے بیان ہوا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک الگ مرثیہ ہے۔ اس میں بند نہیں ہیں۔ ایک طویل نظم کی ہیئت میں انسٹھ شعروں میں ماہ محرم الحرام، واقعۂ کربلا اور اس سے منسلک بعض حقائق پیش ہوئے ہیں، کبھی ایک مصرعے میں کبھی ایک دو شعر میں۔ دیکھئے اس کے چند شعر:۔

مہینہ ہے یہ وہ جس میں مصیبت کی تھی طغیانی　　اسی میں کشتیٔ آل نبی ہوئی آہ طوفانی
حسین ابنِ علی کی ہے شہادت اس مہینے میں　　ہوا ہے وہ گرفتارِ مصیبت اس مہینے میں
اسی میں تیر مشکِ حضرتِ عباس پر برسے　　اسی میں ساقیٔ کوثر کے فرزند آب کو ترسے

مہینہ ہے یہ وہ ابن حسن کی جس میں شادی تھی　　عجب شادی تھی پانی کے بھی پینے کی منادی تھی

شاعر اس سانحے میں سربستہ مصلحت خداوندی پر بھی اظہار خیال کی کوشش کرتا ہے:۔

عجب کیا تھا اگر طبقہ زمیں کا سب الٹ جاتا　　سیہ ہوجاتے مہر و مہ فلک کا سینہ پھٹ جاتا
عجب کیا ہے یہ موجودات ساری سب عدم ہوتی　　مبدّل نیستی کے ساتھ ہستی یک قلم ہوتی
اگر تاج انبیا کے سر سے ڈھل جاتا عجب کیا تھا　　گرا تھا خاک پر ابن علی اس کا سبب کیا تھا
کوئی کیا سمجھے کب ادراک کو اس جا رسائی ہے　　یہ شان بے نیازی ہے یہ شانِ کبریائی ہے

صنف مرثیہ شاعری کا ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے شاعر کے مذہبی احساسات اور آل نبیؐ سے محبت اور عقیدت کا اظہار ایک خاص تناظر میں ہوتا ہے۔ حق پرستی، بلند کرداری، ایثار اور قربانی کا سبق ملتا ہے۔ اس عظیم سانحے کی ترجمانی میں شاعروں نے دوسرے گوشے بھی نکالے ہیں۔ کردار نگاری، سیرت نگاری، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری، ماحول نگاری، حضرت امام حسینؓ اور ان کے اعزا و اقربا کے جذبہ شہادت، رزم اور شہادت کی ملفوظی تصویر کشی میں صناعی کا مظاہرہ کیا ہے۔ راسخ کے دور میں مرثیہ نگاری کے عناصر ترکیبی متعین نہیں ہوئے تھے تاہم انہوں نے بعض اجزا کو بڑی چابکدستی سے برتا ہے اور اپنے شعور فن کی غمازی کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے مراثی کی ادبی اور تاریخی حیثیت مسلم ہے۔

رباعی نگاری

رباعی ایک مشکل اور نازک صنف سخن ہے۔ اس کے لیے بحر ہزج کے چوبیس اوزان متعین ہیں۔ رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ تیسرا مصرع عموماً بے قافیہ ہوتا ہے تاہم بعض اکابرین کے یہاں خال خال تیسرے مصرعے میں بھی قافیہ مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میرؔ کی یہ رباعی دیکھئے:۔

ہجراں میں کیا جب نے کنارا آخر
اسباب گیا جینے کا سارا آخر
نے تاب رہی نہ صبر و یارا آخر
آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

رباعی موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر بڑی لچکدار صنف ہے۔اس کی ترنم ریزی شاعر کو سرمست بنا دیتی ہے۔ اس میں حیات و کائنات کے سارے معاملات و مسائل سما سکتے ہیں مگر اردو میں زیادہ تر رباعیاں فکر و فلسفہ،عشق و خمریات،تصوف اور اخلاقیات، ذاتی غم اور مدح پر مبنی ہیں۔ راسخ کے اکثر پیش روؤں نے عمدہ رباعیاں لکھی ہیں۔راسخ نے بھی بڑے شوق سے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ان کے دیوان میں ۷۷ رباعیاں شامل ہیں۔ان کی نوعیت حمدیہ،نعتیہ،منقبت، رثائی،صوفیانہ، اخلاقی،عشقیہ اور مدحیہ ہے۔دیوان کی یہ پہلی رباعی حمدیہ ہے:۔

انساں ہی کا دل نہیں تری خلوت گاہ
ہر چشم کو ہے ظہور سے تیرے راہ
کس کس قالب میں جلوہ فرما ہے تو
کیا کیا ہیں ترے لباس اللہ اللہ

دو نعتیہ، ایک منقبت اور ایک 'دو تعزیت امام حسینؓ ' رباعی درج ہے۔ان پانچ ابتدائی رباعیوں کے بعد مختلف النوع رباعیوں کا سلسلہ ہے۔کہیں کہیں مدحیہ 'در وصف عدل' در بیان سر پا اختلال قائل وغیرہ عنوانات بھی قائم کئے ہیں۔ دیکھئے ان کے عشقیہ جذبات رباعیوں میں کس طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں:۔

مشتاق کو اپنے ہائے ترساتے ہو
پردہ کرتے ہو مجھ سے شرماتے ہو
ظاہر میں تو سامنے نہیں آتے کبھو
دل میں ہر لحظہ کیوں چلے آتے ہو

☆☆

ہم ہیں اب اور کوئے رسوائی ہے
در پر تیرے دھونی ہم نے لگوائی ہے
دیکھیں تو کہاں تلک یہ کھنچے ہے سر
اک آگ ترے عشق نے سلگائی ہے

بعض رباعیوں میں بھی غزلوں کی طرح فراق محبوب کی کسک اور حزن ہے۔محبوب کی سنگ دلی اور اغماز کا درد جا بجا نمایاں ہے:۔

تھی چشم نہ دربدر پھراؤگے ہمیں   پاس اپنے بلاؤگے، بٹھاؤگے ہمیں
کب تھی یہ خبر کہ خانماں سے کھوکر   دروازے سے اپنے بھی اٹھاؤگے ہمیں

☆☆

جسم آہ تمام موردِ سنگ ہوا   جوں قیس میں اپنی قوم کا ننگ ہوا
آنکھوں کی یہ ہیئت ہوئی روتے روتے   لب خشک ہوئے چہرے کا یہ رنگ ہوا

انہوں نے ایک رباعی میں اپنے مزاج اور اعلیٰ ظرفی کی غمازی کی ہے۔عشقیہ جذبات اور غیرتِ عشق کی کشمکش اور غیرت مندی کے غالب آنے کی بڑی عمدہ اور پرسوز ترجمانی دیکھئے:۔

غم تیرا کسو کو کب سناتا ہوں میں   اس راز کو کب زباں پہ لاتا ہوں میں
کہنے نہیں دیتی مجھے یہ غیرتِ عشق   دل سے بھی ترا درد چھپاتا ہوں میں

راسخ ایک مشاق اور ہنر مند فنکار ہیں۔وہ عشق مجازی میں عشق حقیقی کا رنگ بھرنے کا ہنر جانتے ہیں۔آسان اور بول چال کی زبان میں کتنا حسین پیرایہ اختیار کیا ہے:۔

دن ہو پردوں میں رات پردوں میں ہو
کچھ جھوٹ نہیں یہ بات پردوں میں ہو
دشوار ہے دیکھنی تمہاری صورت
آنکھوں میں ہو میری، سات پردوں میں ہو

ان کا صوفیانہ مزاج بجا بجا ابھرتا ہے۔ وہ عشق مجازی کی ناکامیوں اور نامرادیوں سے دل برداشتہ ہوکر ہر طرح کی مادی آسودگی سے کنارہ کش بھی ہوتے ہیں اور اس کے بے معنویت کا بھی ثبوت دیتے ہیں:

تائب ہوئے میکشی سے راسخ بارے   اوقات ہیں ان کے صرف طاعت سارے
میخانے میں اب بھی جانکلتے ہیں کبھو   سجادۂ محرابی بغل میں مارے

☆☆

جب تک جیے مست جامِ غفلت ہی رہے — غافل معنی سے محو صورت ہی رہے
اس عشق مجازی سے دل ان کا نہ پھرا — راسخ افسوس بے حقیقت ہی رہے

☆☆

کیا کیا ابرار عشق میں خوار ہوئے — صد گو نہ ملامت کے سزاوار ہوئے
بااین ہمہ شیخی و تقدس راسخ — بازیچۂ کودکانِ بازار ہوئے

رباعیوں کی بڑی تعداد اخلاقیاتی عناصر سے مملو ہے۔ان کی عارفانہ نگاہ میں دنیا بے مایہ اور حقیر شے ہے۔اس لئے وہ ترک دنیا کا مشورہ دیتے ہیں:۔

راسخ تبہ احوال رہوگے کب تک
یوں محو خط و خال رہوگے کب تک
پیری آئی، گئی جوانی صاحب
بازیچۂ اطفال رہوگے کب تک

☆☆

کیا اس میں ہے یوں جو چاہو ہو اس کے تئیں
راسخ چھوڑوگے کب، کہو اس کے تئیں
کرنا ہی نہ تھا لوئی دنیا سے نکاح
یہ فاحشہ ہے طلاق دو اس کے تئیں

چند رباعیاں مناجات کے طرز پر بھی ہیں۔ان میں اپنی خطاؤں کا اعتراف بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی درخواست بھی ہے۔ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

ہر چند ہوں یارب میں سراپا تقصیر — شایاں ہوں اس کی ٹھہرے جو کچھ تعذیر
سرگرم ہوں پر عذر گنہ کا دل سے — کر عذر مرا قبول اے عذر پذیر

راسخ کی رباعیوں سے مجموعی طور پر نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر قابل قدر رباعیاں لکھی ہیں اور موضوع و مضمون کو بڑے سلیقے سے نبھایا ہے۔اپنے جذبات، خیالات، مشاہدات، تجربات اور تخیلات کو ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔غزلوں کی طرح رباعیوں میں بھی محتاط،

معیاری اور اعتدال پسندانہ اسلوب اپنایا ہے۔الفاظ، تراکیب اور استعارات میں کہیں کہیں بڑی ندرت اور خلاقی کا مظاہرہ کیا ہے۔مثلاً بازیچۂ کودکان بازار، بازیچۂ اطفال، انگارۂ آدم، فلک اطلس پوش، کہکشاں مرصع بردوش، شہباز خیال، تدرو معنیٔ تازہ، تصویر شمع سوزاں وغیرہ نہایت خوبصورت، نادر اور بامعنی ترکیبیں وضع کی ہیں نیز انہیں اتنی عمدگی اور برجستگی کے ساتھ برتا ہے کہ اسلوب کی مجموعی تشکیل اور تاثیر میں لطف پیدا ہوگیا ہے اور ان کی رباعیوں کی ادبی اہمیت میں اضافے کا سبب ہوا ہے۔

❁

حواشی:

(1) نوائے وطن،ص:۸۹
(2) تاریخ ادب اردو، اٹھارویں صدی (جلد دوم) ص:۷۱۰، مطبوعہ دہلی ۲۰۱۹ء
(3) تذکرہ مسرت افزا،ص:۱۰۹، ۱۰۸، ترجمہ مجیب قریشی مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۸ء
(4) دو تذکرے،ص:۳۶۱ مرتبہ کلیم الدین احمد، مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۵۹ء
(5) ایضاً ص:۳۶۲
(6) نوائے وطن،ص:۸۵
(7) راسخ،ص:۹۶/حاشیہ (تپاں قدیم عظیم آباد کے قریبی علاقہ پھلواری/موجودہ گریٹر پٹنہ کا حصہ/کی خانقاہ مجیبیہ کے مسند نشیں تھے۔وہ پُرگو شاعر تھے۔فارسی میں ان کے دو ضخیم دیوان ہیں۔)
(8) کلیات راسخ، مطبوعہ عظیم آباد، ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء
(9) مثنویات راسخ،ص:۸۴
(10) تاریخ ادب اردو، اٹھارویں صدی (جلد دوم) ص:۵۵۷، مطبوعہ دہلی، ۲۰۱۹ء
(11) ایضاً ص:۷۱۲
(12) راسخ عظیم آبادی (مونوگراف) ص:۱۳، مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء
(13) ایضاً ص:۲۳
(14) تاریخ ادب اردو (جلد اول) ص:۲۶۶ مولفہ: وہاب اشرفی مطبوعہ دہلی، ۲۰۰۵ء
(15) راسخ،ص:۱۱-۱۰، مصنفہ: حمید عظیم آبادی، مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۵۰ء

(16) محمد تقی میر، ص:۲۰۱۷، مصنفہ ڈاکٹر جمیل جالبی، مطبوعہ دہلی، ۱۹۸۳ء
(17) اردو مثنوی شمالی ہند میں، ص: ۲۷۰، مصنفہ گیان چند جین، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء
(18) ایضاً ، ص:۲۷۱
(19) مثنویات راسخ، ص:۱۰۸۔۱۰۷
(20) راسخ عظیم آبادی (مونوگراف) ص:۳۳۔۳۲
(21) ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، ص:۲۸۹، مصنفہ گوپی چند نارنگ، مطبوعہ لاہور، ۲۰۰۳ء
(22) ایضاً ص:۲۸۹
(23) دیوان راسخ عظیم آبادی، ص:۵۸۔۵۵، مرتبہ: ڈاکٹر شکیب ایاز
(24) راسخ عظیم آبادی (مونوگراف)، ص:۴۱

راسخ عظیم آبادی: ادیبوں کی نظر میں

برصغیر ہند و پاک کے چند اہم شاعروں اور ادیبوں نے کلام راسخ کا فکری وفنی جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ شاد عظیم آبادی، حمید عظیم آبادی، عظیم الدین احمد، اختر اورینوی، لطف الرحمٰن، وہاب اشرفی، شکیب ایاز، جمیل جالبی اور فاروق ارگلی نے بڑی گہرائی سے ان کی شاعری پر نظر ڈالی ہے اور نپے تلے انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہر چند یہ رائیں عموماً غزل گوئی اور مثنوی نگاری پر محیط ہیں، ان سے راسخ کا فکر و خیال اور طرز بیان واضح ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں کے اہم اقتباسات بہ لحاظ سن طباعت یہاں درج کئے جاتے ہیں:

(۱) شاد عظیم آبادی (سید علی محمد۔ پیدائش:۱۸۴۶ء، وفات:۱۹۲۷ء)

''سارے کلیات کو دیکھ جاؤ تو یہی معلوم ہوگا کہ ہر جگہ بندش میں، ترکیب معنی میں، لفظوں کی ساخت میں میر تقی مرحوم کی ہو بہو تقلید کر رہے ہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا مزہ دار جیوڑا ہے۔ وہ کبھی کبھی بتانِ بازار کی سیر بھی کر لیتے ہیں اور ان کی طبیعت کا سوز و گداز بعض موقعوں میں عشق ظاہری کی بدولت بھی معلوم ہوتا ہے لیکن شیخ صاحب کی تمام ہمت تصوفانہ مضمون کی طرف جھکی ہوئی ہے اگرچہ ان کی غزلیں میر صاحب کی غزلوں سے پست اور کم ہیں اور نہ اس افراط سے عمدہ مضمون اس میں پیدا کئے ہیں لیکن تیرہ مثنویوں میں وہ بلا کے عاشقانہ شعر کہے ہیں اور ایسے کہے ہیں کہ اس سے زیادہ سوز و گداز کے مضمون پیدا کرنا مشکل ہی مشکل ہے۔''

''شیخ (غلام علی راسخ) مرحوم کے اوصاف میں سے ایک یہی جملہ کافی ہے کہ وہ فطرتی شاعر اور طبعی موزوں طبع تھے۔ خطۂ بہار کو اس عزیز کے نام نامی سے افتخار اور اس کی استادی پر مباہات ہے۔ اس شہسوار میدان بلاغت نے سمند سخن کو ایسا تیز بڑھایا کہ ساتھ والے گرد قدم تک نہ پہنچ سکے اور اس کا شہباز فکر ایسا بلند

ہوا کہ شکارِ گاہ معنی کے صید گیر منہ دیکھ کر رہ گئے۔''

(نوائے وطن، ص:۹۰، ۹۷۔۷۸ مصنفہ: شاد عظیم آبادی، مطبوعہ عظیم آباد، ۱۸۸۴ء)

(۲) سید عبدالحمید عظیم آبادی (تلمیذ شاد عظیم آبادی، راسخ پر پہلی کتاب کے مصنف، پیدائش: ۱۸۹۶ء وفات: ۱۹۶۳ء)

''راسخ کو فطرت کی طرف سے شاعرانہ طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ جب کوئی غیر معمولی کیفیت رونما ہوتی یا ان کے جذبات کو ٹھیس لگتی تو ان کی شاعرانہ طبیعت میں ایک تموج پیدا ہوتا ہے اور وہ ایک بڑھتے ہوئے دریا کی طرح شعروں کی صورت میں موج خیز نظر آتا۔ ان کی شاعرانہ تخئیل اور ان کے وسیع و عالمگیر شاعرانہ جذبات، صرف محبت اور عشق ہی کی دنیا تک محدود نہ تھے بلکہ فلسفہ و معرفت کے عمیق سمندروں کو بھی اپنے دامن میں لئے تھے۔ لفظوں کے انتخاب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ غیر فصیح، بھدے اور ایسے الفاظ جو سماعت پر بار ہوں، آپ ان کے نظم کرنے سے احتیاط کرتے تھے۔ غیر مہذب اور کریہہ الفاظ سے آپ کا کلام سراسر پاک ہے۔ کلیات میر میں اکثر جگہ فحش اور مبتذل اشعار بھی پائے جاتے ہیں اور کلیات میر رطب و یابس کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے، جس میں استادانہ ہمواری نہیں پائی جاتی لیکن راسخ کا کلام ابتذال و رطب و یابس سے بالکل معرا ہے اور یہ شرف شاید درد اور راسخ ہی کے لئے مخصوص تھا۔

ہندی الفاظ راسخ اپنے شعروں میں اس خوبی سے نظم فرماتے تھے کہ کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا تھا .....راسخ کی زبان ایسی صاف، شستہ، آسان اور دلکش ہے کہ بول چال معلوم ہوتی ہے۔ کلام میں ایسی روانی ہے کہ نظم اور نثر میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔''

(راسخ، ص:۵۲۔۵۱، مصنفہ: حمید عظیم آبادی، مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۵۰ء)

(۳) ڈاکٹر عظیم الدین احمد (شاعر، استاد عربی، فارسی و اردو، پیدائش: ۱۸۸۰ء، وفات: ۱۹۴۹ء)

''کچھ دیر راسخ کے باغ سخن کی رواروی میں سیر کر لیجئے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ گلوں کی بوقلمونی اپنی رنگا رنگی اور عطر بیزی سے نظارہ کنوں کے دماغ کو سکون بخشتی ہے اور فلسفیوں کو کسی خاص مفہوم کا تتبع سرگرانی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا آیئے، ان کے چمن سے چند پھول توڑیں، دیکھیں اور سونگھیں۔

خارِ پا ہو کے نہ رہ، اس چمن عالم میں — چاہئے یوں کہ تو سب کا گل دستار رہے

ملاحظہ کیا؟ اس پھول کی خوشبو جرأت خیز اور اس کا رنگ شجاعت بیز ہے۔ ذلت کی زندگی کس

غیرت دار کو پسند ہو سکتی ہے؟ ہمت تو کہتی ہے کہ اگر زندہ رہئے تو اس خوش رنگ اور عطر آگیں پھول کی طرح جسے عالم بہ نظر الفت دیکھے اور سر چڑھائے۔''

''الغرض میر صاحب کی شاعری کی طرح راسخ کی شاعری بھی حقیقت و مجاز یعنی جذب و تخیل میں منقسم ہو سکتی ہے۔ اگر میر صاحب کے ہاں مجاز کا پلہ گراں ہے تو راسخ کے ہاں حقیقت کا مگر سامعین کے عقول کو آتش نفس سے جلا دینے والا سوز اور دلوں کو ترنم ریزی سے اسیر کرنے والی دل گرفتگی دونوں کی شاعری کی روح رواں ہیں۔

المختصر معرفت باری، فنائے جسد، بقائے روح، بوقلمونی مگر بے اعتباریٔ عالم، غائر سے غائر خلش ہائے دل، وسیع سے وسیع نظارۂ عالم، متانت کے ساتھ شوخی، فقر کے ساتھ غنا، حسن حقیقی کی دلفریب تصویر، معشوق مجازی کا فتنہ خیز مجسمہ، غم کا پہاڑ، اشک کا دریا، آہ کا طوفان، جذبات کے جوالا مکھی کی آتش فشانی، کوائف نفسی کے سمندر کی طغیانی، یہ سب کچھ راسخ کے ہاں موجود ہیں۔''

(باقیات عظیم الدین احمد، ص:۷۳۔۷۱، ناشر ادارہ تحقیقات اردو، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۷ء)

(۴) پروفیسر اختر اورینوی (شاعر، فکشن نگار اور نقاد۔ پیدائش: ۱۹۱۰ء، وفات: ۱۹۷۷ء)

''میرے خیال میں میر اور راسخ کی شاعری تجربہ اور ہیئت دونوں اعتباروں سے آپس میں اختلاف رکھتی ہیں۔ میر کی شاعری کی ترکیب کے اندر جذبات کا عنصر نسبتاً نمایاں تر ہے اور راسخ کے یہاں تخیل کا عنصر نسبتاً واضح تر۔ میر نازک اور لطیف تجربات کو پیش کرنے کی صلاحیت میں ممتاز ہیں اور راسخ رنگین اور رفیع تجربات کی ترجمانی میں ماہر۔ میر کے یہاں جو ربودگی اور گداز پایا جاتا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میر کی محبت، سپردگی اور فنا کی حد تک پہنچتی ہے لیکن راسخ کا انفرادی رنگ یہ ہے کہ وہ گداز محبت کے عالم میں بھی اتنی لہک ضرور رکھتے ہیں کہ محبت اور زندگی ہی نہیں بلکہ محبوب پر بھی طنز کر سکیں۔ راسخ کے یہاں جوش پایا جاتا ہے، ایک لطیف جوش، راسخ خالق عالم، پر لطیف اور نفیس طنز کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی مقابلے کی روح بھی پھڑک اٹھتی ہے۔ چھری تلے گلا ہونے کے باوجود بھی وہ یہ دم خم رکھتے ہیں کہ آسمان کی کمان کو جھکا دیں، کڑکا دیں، لیکن میر تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ:

''ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی''

میر کا دل جب جلتا بھی ہے تو وہ دوسروں پر نہیں اپنے پر طنز کر لیتے ہیں۔ اپنا مذاق اڑاتے ہیں اور

دوسروں کے لیے سامان عبرت مہیا کرتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری میں مزاح و درد کے عناصر گھلے ملے ہوئے ہیں۔ راسخؔ کے یہاں لطیف طنز ہے لیکن بیتاب۔ اس پہلو سے راسخؔ کچھ کچھ سوداؔ کے مزاج سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن سوداؔ کے مزاج اور فن میں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت بھی پائی جاتی ہے۔ راسخؔ اور میرؔ کے مزاج اور فن میں بڑی گہری داخلیت پائی جاتی ہے۔''

(راسخؔ رحرف آغاز رص:۱۱۔۹، مولفہ: حمیدؔ عظیم آبادی، مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۵۰ء)

(۵) پروفیسر لطف الرحمٰن (شاعر، نقاد اور استاد، بھاگلپور یونیورسٹی، پیدائش: ۱۹۴۱ء، وفات: ۲۰۱۳ء)

''راسخؔ عظیم آبادی کی غزل گوئی کا اصل پہلو وہ ہے جس کا تعلق معنوی کیفیات سے ہے۔ اشعار غزل کی کیفیاتی فضا، سوز و گداز کے عنصر سے معمور ہے۔ ذاتی تجربات، جب پر خلوص انداز میں سادگی اور صداقت کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں تو فطری طور پر کلام میں سوز و گداز کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے شاعر کو خون جگر کا نذرانہ ضرور پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ عنصر بالعموم یاس و حسرت، اندوہ و غم، نامرادی و ناکامی اور شکست و پسپائی کی صورت حال میں فروغ پاتا ہے۔ شاعر غم دل کو پیش کرنے کا وسیلہ شعر گوئی کو بنالیتا ہے۔ اشعار کے پردے میں اپنے معبود، اپنی روح اور اپنے ضمیر کے تمام اندیشوں، مصیبتوں اور تلخ تجربوں کو رمزی اور ایمائی انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کا احساس غم اور اظہار غم ذہن و دل کی تربیت بھی کرتا ہے اور جمالیاتی بصیرت اور روحانی مسرت کی فراہمی کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ ایسے شعروں میں نشتریت تو ہوتی ہے مگر یہ نشتریت خود چارہ ساز ہوتی ہے اور مرہم کا کام بھی کرتی ہے۔ راسخؔ عظیم آبادی نے بھی اپنے عہد کے دکھ درد کو اپنی شخصیت کا حصہ بنایا ہے۔ غم کائنات کو بھی غم حیات کے طور پر محسوس کیا ہے اور پھر اپنے احساسات کو نہایت فنی سلیقے سے شعروں میں منتقل کیا ہے۔........سوز اور درد سے بھرے ہوئے اشعار میں تصنع اور آورد کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ وہ نغمۂ دل دردمند اور لحن جگر سوز ہے جس نے کلام راسخؔ کی معنویت کو اثر خیز اور کشش انگیز بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔''

''راسخؔ کے اسلوب غزل کا دوسرا اہم پہلو اشعار کا ایجاز و اختصار ہے۔ اختصار پسندی اور ایجاز بیانی ہی کی وجہ سے الفاظ کے انتخاب و استعمال میں شعری سلیقہ مندی کی بصیرت غیر شعوری طور پر نمایاں ہوتی ہے۔''

''راسخؔ کی غزل گوئی کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار میں موسیقیت اور نغمگی کی

سرشار کن کیفیت موجود ہے۔''

(راسخؔ عظیم آبادی رمونوگراف رص:۱۶۔۱۴، ناشر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء)

(۶) پروفیسر وہاب اشرفی (نقاد، محقق، مورخ ادب۔ پیدائش: ۱۹۳۶ء، وفات: ۲۰۱۲ء)

''.....میرے خیال میں انہیں (راسخؔ کو) ثانی میرؔ کہنا کچھ زیادہ درست نہیں بلکہ ان کے جوہر کی الگ سے شناخت ممکن ہے جو بالکل ان کے اپنے احوال و کردار پر مبنی ہو سکتی ہے۔ میرؔ کے یہاں گہری داخلیت میں پیچیدگی ہے، ایسی پیچیدگی کہ راسخؔ کے یہاں نہیں ملتی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ سادگی اور بے تکلفی راسخؔ کا مزاج ہے۔ اس میں وہ تہہ داری نہیں جو میرؔ کا طرۂ امتیاز ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جہاں کہیں میرؔ نے عامیانہ پن اور سطحیت اختیار کی ہے۔ اس کا تعلق راسخؔ کے یہاں دور دور تک نہیں ملتا۔ یہ سچ ہے کہ راسخؔ کے یہاں درد ہے، سوز ہے لیکن میریت کا فقدان نمایاں ہے۔ لطف الرحمٰن اس کا احساس دلاتے ہیں کہ راسخؔ کے سوز اور درد میں تصنع اور آورد نہیں بلکہ اثر خیزی اور کشش انگیزی ہے۔ ان کے تغزل میں اختصار پسندی اور ایجاز بیانی نیز سلیقہ مندی اور بصیرت کا پتا ملتا ہے۔ پھر موسیقی اور نغمگی بھی ہے۔ ان کے یہاں صوفیانہ میلان بھی ہے جو وحدت الوجود کا میلان رکھتا ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر لیکن کلام میں وہ تاثیر نہیں جو میرؔ کا خاص رنگ بناتا ہے۔ پھر بھی وہ میرؔ سے قریب کہے جاسکتے ہیں لیکن یہ حد فاصل بے حد اہم ہے اور دونوں شاعروں کو ایک دوسرے میں ضم نہیں کرتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو رجلد اول رص: ۲۶۶، مصنفہ: وہاب اشرفی، مطبوعہ، دہلی، ۲۰۰۵ء)

(۷) ڈاکٹر شکیب ایاز (شاعر، محقق، استاد، پیدائش: ۱۹۴۰ء، وفات: ۲۰۱۳ء)

''راسخؔ خود آگاہ شاعر تھے۔ ان کی تنقیدی بصیرت تیز تھی۔ وہ فارسی اور اردو لسانی تشکیلات سے باخبر تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اشعار میں ان کی خود انتقادی نمایاں ہے:

آغوش میں لفظوں کے ہیں کیا کیا گل معنی   تو نے تو بنایا چمن سطح ہوا کا

راسخؔ کی بصیرت افروزی تہہ بہ تہہ گل معنی کے اوراق میں رقم ہے۔ لفظوں کی آغوش میں ''گل معنی کا ہونا'' نئی بات ہے۔ شاعر، سطح ہوا، پر، چمن آرائی، میں مصروف کار ہے۔ راسخؔ جس طرز خاص سے تخلیقی رشتے کو مامون و متعین کرتے ہیں، وہ تخلیقی عمل کا جزو لاینفک ہے۔ گل معنی پر توجہ دیجئے۔ پھولوں کے

اقسام، ان رنگوں کی شرحیں کہاں سے کہاں انسانی فکر کو مہمیز کرتی ہیں اور ہر رنگ، ہر آن اپنا ظاہری پیکر جسے پیراہن خیال بھی کہہ سکتے ہیں، بدلتا ہے۔ وقت کے حوالے سے رنگوں کی طلسماتی فضا دیکھئے۔ یہاں 'چشم' کو 'ہر رنگ' میں وا ہونا ضروری ہے۔ جلوہ گز راں پر نظر ٹکی ہونی چاہئے۔ ورنہ گل کے مطالب تک رسائی ممکن ہے۔ یہ ہے راسخ کا نظریۂ شاعری جو ان کے شعر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

کہنا پڑتا ہے کہ راسخ کی شاعرانہ گرفت مضبوط تھی۔ وہ فکر و لفظیات دونوں کے سیاق میں اشعار کی گہر بندی کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ راسخ کے کلام پر میر کے اثرات غالب ہیں۔ یہ خیال درست نہیں۔ ایسی رائے میر و راسخ دونوں سے ناآشنائی کی دلیل ہے۔ غزل کے مزاج و آہنگ کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے واضح دو رنگ و آہنگ صاف سنائی دیتے ہیں۔ ایک طرف میر کی آواز ہے تو دوسری جانب ایوان شاعری میں سودا کی گونج سنائی دیتی ہے۔۔۔۔ راسخ شاگرد تو میر کے تھے لیکن وہ مقلد نہ تھے۔ ان کی غزلوں میں فارسی اور عربی لفظیات کی آمیزش سے جو آہنگ مرتسم ہوتا ہے، وہ سودا سے قریب تر ہے۔''

''راسخ کے کلام کی ترقی یافتہ صورت جس شاعر کے یہاں واضح طور پر نظر آتی ہے، وہ ہیں غالب۔ بلکہ راسخ، سودا اور غالب کے مابین ایک عمودی لکیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب اسالیب کے لحاظ سے راسخ سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں۔''

(دیوان راسخ عظیم آبادی، مقدمہ، ص:۱۳، ۱۱، ۱۰، مرتبہ: ڈاکٹر شکیب ایاز، ناشر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۶ء)

(۸) ڈاکٹر جمیل جالبی (نقاد، محقق، مترجم، مورخ ادب، پیدائش: ۱۹۲۹ء، وفات: ۲۰۱۹ء)

''شیخ غلام علی راسخ عظیم آباد میں دہلی روایت کے ایک ممتاز شاعر ہیں جن کے کلام میں شاہ حاتم، میر، سودا اور درد سب کے رنگ و اثرات شامل ہیں اور اسی وجہ سے پونے دو سو سال کی گرد کے باوجود ان کے صحیفۂ شاعری کا رنگ آج بھی ماند نہیں پڑا ہے۔ ان کا کلیات پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک قادر الکلام شاعر اپنے دل کی بات اور اپنے تجربات کا اظہار پر اثر انداز میں کر رہا ہے۔ راسخ کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ شاگرد تو میر کے ہیں لیکن ان کی شاعری کا مزاج حاتم اور سودا کی شاعری سے قریب ہے۔ راسخ کی شاعری میں بھی سودا کی طرح جذبہ و احساس سے زیادہ معنی آفرینی پر زور ہے۔ عام بول چال کی زبان کے بجائے، جو میر کا رنگ زبان ہے، راسخ کے ہاں سودا کی طرح فارسیت کا اثر گہرا

ہے۔ راسخ گرہ، آنسو، دیدۂ پر آب، رونا، رولانا کے الفاظ تو اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں لیکن اس رنگ میں بھی وہ میر جیسے شعر نہیں کہہ پاتے اور زیادہ سے زیادہ شاہ حاتم سے قریب آ جاتے ہیں۔''

مرثیہ گو دل کے ہیں، شاعر ہم اے راسخ نہیں
اس لیے رونا رولانا ہی شعار اپنا ہوا

لیکن اپنے دل کے مرثیہ گو ہونے اور آہ سرد کھینچ کر آنکھوں سے مینہ برسانے کے باوجود راسخ کے غم میں وہ آفاقیت نہیں ہے جہاں غم کے آنسوؤں میں میر کی طرح کائنات سمٹ آتی ہے۔ میر مزاجاً انا پرست ہیں۔ عام زندگی میں اپنی ذات کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں لیکن شاعری میں وہ اپنی ذات کو مٹا کر اسے کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ میر کی شاعری میں ان کی ذات چھپ جاتی ہے۔ راسخ کے ہاں میر کے آنسو تو شامل ہیں لیکن میر کا غم شامل نہیں ہے۔ اسی لیے راسخ کے ہاں تجربے کا تیکھا پن، احساس و جذبہ کی تہہ داری نہیں ہے جو میر کی نمایاں خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے میر کے شعر ہمارے وجود کا حصہ بن جاتے ہیں۔ راسخ کے شعر ان معنی میں بھی میر جیسے نہیں ہیں جیسے قائم چاند پوری کی غزل میں ملتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص:۱۱-۱۰۱۷، مصنفہ: جمیل جالبی، مطبوعہ دہلی ۲۰۱۹ء)

(۹) فاروق ارگلی (مورخ ادب، شاعر، صحافی اور خادم اردو، پیدائش: ۱۹۴۰ء)

''راسخ کا فکری افق عرفان ذات و کائنات کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کرتا ہے۔ وہ سچ مچ کے صوفی شاعر ہیں۔ ان کا کلام ان کے باطن کا آئینہ ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہوتی۔ خیال آئینے کی طرح قاری اور سامع کے سامنے آ جاتا ہے۔

کس قدر بوقلموں جلوہ ہے محبوب اپنا   کوئی بھی اس کی تجلی میں تکرار نہیں

بے ثباتی دنیا اور مالک ارض و سما کی عظمت و رفعت متصوفانہ شاعری کی شان اور جان ہے۔ راسخ عظیم آبادی کے کلام میں روحانیت کی ضوفشانی اور آب و تاب انہیں حضرت خواجہ میر درد جیسے صوفی شعرا کے بہت قریب لے جاتی ہے۔''

''بے ثباتی دنیا پر اردو کے لاتعداد شعرا نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس موضوع پر راسخ کا یہ سادہ سا شعر بہرحال شاہکار کہا جانا چاہئے۔ فرماتے ہیں:۔

شمع سحر ہیں ہم تو کیا بود و باش یاں کی   روشن ہے بے بقائی، اس مجلس رواں کی

راسخ اپنے رنگ وآہنگ میں اپنے عہد کے سچے صوفی شاعر ہیں لیکن وہ اپنے عہد کے انسانی سماج اور زندگی کے حقائق سے بے خبر نہیں ہیں۔ ان کا زمانہ سیاسی الٹ پھیر اور تہذیبی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا دور ہے، راسخ اپنے گرد وپیش کے بدلتے ہوئے حالات اور ذہنی و اخلاقی زوال پر ایک صاحب نظر شاعر کی حیثیت سے براہ راست چوٹ کرتے ہیں۔''

(جواہر عظیم آباد، جلد اول، ص:۴۶-۴۵، مصنفہ: فاروق ارگلی، مطبوعہ نئی دہلی، ۲۰۱۸ء)

راسخ عظیم آبادی پر مطبوعہ کتابیں

(۱) راسخ مصنفہ: حمید عظیم آبادی، مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۵۰ء

سید عبدالحمید عظیم آبادی نے راسخ پر پہلی کتاب ۱۹۳۸ء میں لکھی تھی۔ دیباچۂ مصنف کے مطابق اس کے مسودے پر تعارف سید عظیم الدین احمد نے لکھا تھا جو 'معاصر' پٹنہ میں شائع بھی ہوا مگر بہ وجوہ اس کی طباعت عظیم الدین احمد کی زندگی میں نہیں ہوسکی۔ نظر ثانی کے بعد ۱۹۵۰ء میں اشاعت ہوئی۔ غالباً اسی بنا پر مذکورہ تعارف اس میں شامل نہیں ہے۔ چھیانوے صفحوں کی اس کتاب میں 'حرف آغاز' کے عنوان سے اختر اورینوی کا جامع مضمون گیارہ صفحوں پر محیط ہے۔ اس کے بعد چوون صفحات میں حمید عظیم آبادی نے دیباچہ لکھا ہے جس میں راسخ کے حالات زندگی، اس عہد میں عظیم آباد کا ادبی ماحول، ان کے استاد اور تلامذہ کی تفصیل نیز شاعری کا جائزہ درج ہے۔ اس وقت تک انہیں جو مواد دستیاب ہوسکا، اس کے حوالے بھی موجود ہیں۔

آخری تیس صفحوں میں راسخ کے کلام۔ غزلیات، مفرد اشعار، قطعات اور رباعیات کا انتخاب درج ہے۔

(۲) مثنویات راسخ مرتبہ: ڈاکٹر ممتاز احمد، مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۵۷ء

پونے پانچ سو صفحات کی اس کتاب میں دو شق ہیں۔ پہلی شق ۱۶۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس پر عنوان ہے 'مقدمہ'۔ اس میں گیارہ ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب وار تقریباً تمام متعلقہ مواد پیش کیا گیا ہے جس سے مثنویوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ عنوانات اس طرح ہیں:-

(۱) پس منظر (۲) اردو مثنوی (۳) بہار میں اردو مثنوی (۴) راسخ تذکروں، رسالوں اور کتابوں میں (۵) حالات راسخ (۶) استاد راسخ (۷) راسخ کے شاگرد (۸) راسخ اور میر (۹) ماخذ کلام راسخ (۱۰) راسخ۔ مثنوی نگار کی حیثیت سے (۱۱) مثنویات راسخ پر ایک نوٹ

دوسری شق کا عنوان 'مثنویات راسخ' ہے۔اس کے تحت درج ذیل انیس مثنویاں بڑی تلاش وجستجو اور صحت متن کے ساتھ نقل کی گئی ہیں:۔

(۱) سبیل نجات (۲) کشش عشق (۳) نیرنگ محبت (۴) جذب عشق (۵) شرح حال (۶) مثنوی عابد کہ دو زوجہ داشت (۷) حسن وعشق (۸) ناز و نیاز (۹) اعجاز عشق (۱۰) نورالانظار (۱۱) گنجینۂ حسن (۱۲) مرأت الجمال (۱۳) مکتوب الشوق (۱۴) مثنوی در بیان انقلاب زمانہ وشکایت فلک (۱۵) مثنویٔ مدحیہ (۱۶) حکایت دراحوال تاجر (۱۷) حکایت در بیان تاجر (۱۸) ایک اس شہر میں اچکّا ہے (۱۹) مثنوی مدح جناب مولوی محمد راشد صاحب

راسخ نے اپنی بعض مثنویوں میں جو ترمیم اور اضافہ کیا ہے، اس کا متن بھی درج کیا گیا ہے۔آخر میں مددگار کتابوں کی فہرست بھی ہے۔

یہ کتاب تحقیق، تنقید اور ترتیب کا عمدہ نمونہ ہے۔اس میں راسخ عظیم آبادی کے متعلق بھی اطمینان بخش مواد ہے اور ان کی تمام دستیاب مثنویاں بھی درج ہیں۔

(۳) راسخ عظیم آبادی مصنفہ: لطف الرحمٰن مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء

ہندوستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے۔اس میں کل سڑسٹھ صفحات ہیں۔

اس میں درج ذیل پانچ ابواب ہیں:۔

پہلا باب : حالات زندگی

دوسرا باب : اساتذۂ سخن

تیسرا باب : شاعری (۱) غزل نگاری (۲) مثنوی نگاری (۳) مرثیہ نگاری (۴) قصیدہ نگاری (۵) رباعی نگاری

چوتھا باب: تلامذۂ سخن

پانچواں باب: انتخاب کلام

پروفیسر لطف الرحمٰن نے اس میں راسخ کی شاعری کا صنف وار عمدہ جائزہ لیا ہے اگر وہ دوسرے ابواب پر مزید توجہ دیتے اور تفصیل سے لکھتے تو اور بہتر کتاب سامنے آتی۔

(۴) راسخ۔شخصیت اور فن مصنفہ: ڈاکٹر محمد ممتاز عالم مطبوعہ پٹنہ، ۲۰۰۰ء

اس کتاب میں کل ایک سو چوالیس صفحات ہیں۔ پہلے تین صفحوں میں مصنف کا 'عرض حال' اس کے بعد پروفیسر کلیم عاجز کی جامع تقریظ بعنوان 'دھوپ میں سایۂ' درج ہے۔اس کے بعد مصنف نے عنوان لگایا ہے___ 'کلاسیکی ادب': حیثیت اور اہمیت، جو سات صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔صفحہ ۱۶ سے ۲۵ تک سوانحی خاکہ درج ہے جس میں موضع سائیں جا کر مصنف نے لوگوں کے بیان کے مطابق راسخ کا نسب نامہ بھی ترتیب دیا ہے جو صفحہ ۱۹ پر نقل ہے۔اس میں ان کے جدامجد کا نام شیخ خدام علی بتایا گیا ہے۔یہ نسب نامہ بغیر کسی دستاویز یا ثبوت کے ترتیب دیا گیا ہے۔سب کچھ وہاں کے ایک عمر رسیدہ شخص محمد آل حسن کے زبانی بیان پر مبنی ہے۔اس لئے تحقیقی نقطہ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

کم وبیش پچاس صفحوں میں مصنف نے راسخ کی غزلوں پر ستائشی انداز سے تبصرہ کیا ہے۔ضمنی طور پر رباعیوں پر بھی مختصراً رائے دی ہے۔آخر کے ۶۷ صفحات میں یعنی ۸۷ سے ۱۴۴ تک منتخب غزلیں، رباعیاں، مخمسات اور اشعار درج ہیں۔کور پیج کی پشت پر پروفیسر اسلم آزاد نے کتاب پر مثبت رائے دی ہے۔

اس کتاب سے راسخ عظیم آبادی کی زندگی اور شاعری کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔

کتابیات

بنیادی

کتاب	مصنف/مولف/مرتب	مطبع/ناشر	مقام وسن اشاعت
۱۔کلیات راسخ		خیر المطابع	عظیم آباد،۱۸۹۳ء
۲۔دیوان راسخ عظیم آبادی	بخط شاعر	عکسی ایڈیشن، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری	پٹنہ،۱۹۹۴ء
۳۔دیوان راسخ عظیم آبادی	ڈاکٹر شکیب ایاز	ایضاً	پٹنہ،۲۰۰۶ء

ثانوی

۱۔باقیات عظیم الدین احمد	۔	ادارۂ تحقیقات اردو	پٹنہ،۱۹۸۷ء
۲۔تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	وہاب اشرفی	۔	دہلی،۲۰۰۵ء
۳۔تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	جمیل جالبی	۔	دہلی،۲۰۱۹ء
۴۔تذکرہ خم خانۂ جاوید (حصہ سوم)	لالہ سری رام	۔	دہلی،۲۰۱۷ء
۵۔تذکرہ ریاض الفصحا	مصحفی	۔	دہلی،۱۹۳۴ء
۶۔تذکرہ سخن شعرا	عبدالغفور نساخ	اتر پردیش اردو اکادمی	لکھنؤ،۱۹۸۲ء
۷۔تذکرہ طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین	اتر پردیش اردو اکادمی	لکھنؤ،۱۹۸۳ء
۸۔تذکرہ عشقی	ترجمہ عطا کاکوی	۔	پٹنہ،۱۹۶۹ء
۹۔تذکرہ گلشن بے خار	مصطفٰی خاں شیفتہ	۔	لاہور،۱۹۷۳ء
۱۰۔تذکرہ مسرت افزا	امراللہ الہ آبادی تلخیص وترجمہ: عطا کاکوی	۔	پٹنہ،۱۹۶۸ء

۱۱۔تذکرہ مسرت افزا	ترجمہ: مجیب قریشی	۔	دہلی،۱۹۶۸ء
۱۲۔جواہر عظیم آباد (جلد اوّل)	فاروق ارگلی	۔	دہلی،۲۰۱۸ء
۱۳۔حیات فرہاد	شاد عظیم آبادی	۔	اعظم گڑھ،۱۹۲۷ء
۱۴۔دو تذکرے	کلیم الدین احمد	۔	پٹنہ،۱۹۵۹ء
۱۵۔راسخ	حمید عظیم آبادی	۔	پٹنہ،۱۹۵۰ء
۱۶۔راسخ عظیم آبادی (مونوگراف)	لطف الرحمٰن	ساہتیہ اکادمی	نئی دہلی،۱۹۹۷ء
۱۷۔راسخ۔شخصیت اور فن	محمد ممتاز عالم	۔	پٹنہ،۲۰۰۰ء
۱۸۔کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست	نصیر الدین ہاشمی	۔	حیدرآباد،۱۹۵۷ء
۱۹۔گل رعنا	سید عبدالحئی	۔	اعظم گڑھ،۱۹۵۰ء
۲۰۔مثنویات راسخ	ڈاکٹر ممتاز احمد	۔	پٹنہ،۱۹۵۷ء
۲۱۔نوائے وطن	شاد عظیم آبادی	۔	عظیم آباد،۱۸۸۴ء

مخطوطہ/رسالہ

۱۔دیوان راسخ	مملوکہ ایشاٹک سوسائٹی	مخطوطہ نمبر ۹۹۸ (پرانا)	کلکتہ
۲۔معاصر	عبدالمنان بیدل عظیم آبادی		پٹنہ،۱۹۵۲ء
۳۔صنم	رفیع الدین/وہاب اشرفی		پٹنہ،جنوری،اپریل،۱۹۵۹ء
۴۔ندیم (بہار نمبر)	انجم مانپوری		گیا،جولائی۔اگست،۱۹۳۳ء

انتخاب کلام

غزلیات

کب غنچہ کو دیکھ اس کا دہن یاد نہ آیا   کس وقت کہ وہ رشک چمن یاد نہ آیا
تھا جی میں کہ دشواریٔ ہجر اس سے کہیں گے   پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
کیا کیا نہ تھے اقرار پہ دل لیتے ہی تجھ کو   اک ان میں سے اے عہد شکن یاد نہ آیا
ہے چال تری وہ کہ ہمیں جس کے مقابل   اس چرخ جفا جو کا چلن یاد نہ آنا
دل سے ترے دیوانوں کی پوشش ہے فراموش   پیراہن تن کیا انہیں تن یاد نہ آیا
آ نکلے کبھو بھول کے بھی تم نہ ادھر ہائے   میرا تو تمھیں بیت حزن یاد نہ آیا
ہستی نے عدم دل سے بھلا ہی دیا راسخ
غربت میں رہے یوں کہ وطن یاد نہ آیا

☆☆

لب ہیں خشک اور چشم تر ہے اب   عشق کا روئے دل ادھر ہے اب
آپ سے جانے کے مہیا ہیں   ہم کو در پیش یہ سفر ہے اب
قدردانِ سخن نہیں کوئی   کتنا بے آب یہ گہر ہے اب
عشق میں ہے زیاں ہی باعث نفع   کس کو اندیشۂ ضرر ہے اب
غم کو راسخ کے تم نے طول دیا
قصہ ہی ان کا مختصر ہے اب

☆☆

نہ کام آوے واں کچھ امیری کی دولت   یہیں تک ہے شاہی وزیری کی دولت
اکیلا تو رہ چاہتا ہے جو شہرت   جہاں گیر ہو گوشہ گیری کی دولت
گرفتاریٔ دل بہت کام آئی   رہائی ہوئی اس اسیری کی دولت

سخن ہی تو ہے مایہ اہل سخن کا   یہی ہے شفائی نظیری کی دولت
کہیں ہیں سبھی ان کو اب شاہ صاحب
ہوئی شاہ راسخ فقیری کی دولت

☆☆

جہاں سے دل کے اٹھنے کی مرے یاری ہوئی باعث   مری آزادگی کی یہ گرفتاری ہوئی باعث
غرور ان کا کیا دونا ہمارے عجز ہر دم نے   اس ان کے عجب کی یہ ناز برداری ہوئی باعث
عطا کی آبرو مجھ کو ملا کر خاک میں ان نے   مری غربت کی میری ذلت و خواری ہوئی باعث
نقاب چہرۂ مطلوب عجب علم و دانش تھا   مری غفلت کی یارو میری ہشیاری ہوئی باعث
کریم ایسا ہے وہ راسخ کہ بخشے سب گنہ اس نے
مرے عفو گنہ کی اس کی غفاری ہوئی باعث

☆☆

ہجر میں آوے کیا بحال مزاج   جز وصال اب نہیں ہے اور علاج
وہ جفاکار ایسا ہے جس کو   دے ہے بے مہر آسمان خراج
لاگ یاں جی کی اس غنی سے ہے   جس کے شاہ و گدا ہیں سب محتاج
انقلاب فلک ہے سیر کی جا   ان نے کشکول کر دیئے ہیں تاج
زندہ ہے نام میر، راسخ سے
کون ہے شاعروں میں ایسا آج
بود و باش جہانِ فانی ہیچ   چار دن کی یہ زندگانی ہیچ
ہفت اقلیم کا خیال عبث   آرزوئے جہاں ستانی ہیچ
ہے بقا کس کو غیر ذات خدا   حسرتِ عمر جاودانی ہیچ
یار جانی سے زیست کا ہے مزا   بے ملاقات یار جانی ہیچ
قصہ طول امل کا کوتہ کر   کہ سراسر ہے یہ کہانی ہیچ
پیش فریاد بلبل قفسی   مرغ خوش خواں کی خوش زبانی ہیچ

راسخ اپنے بھی کام آئے نہ تم
سب تمہاری یہ کاردانی ہیچ

☆☆

اس چمن میں ہے بُری اب دل گیر کی طرح   کبھو ہوتا نہیں وا غنچہ تصویر کی طرح
صف عشاق میں اس شوق جفا جو کی نگاہ   میرے ہی دل کے فقط پار ہوئی تیر کی طرح
در سے اُن کے میں کہیں جا نہیں سکتا کہ وفا   پائے دل کی مرے زنجیر ہے زنجیر کی طرح
جا نہ ظاہر پہ مرے، حسن کو باطن کے دیکھ   خاک ہوں پر ہمگی زر ہوں میں اکسیر کی طرح
مایہ دار سخن اب کون ہے ہم سا راسخ
شاہِ اقلیم معانی ہوئے ہم میر کی طرح

☆☆

سیل اشک سرخ سے میرے جہاں ہوجائے سرخ   موج سر کھینچے گر اس کی آسماں ہوجائے سرخ
شوق روئے گل میں روئی بس کہ بلبل کیا عجب   سبز ہوکر اس کا خار آشیاں ہوجائے سرخ
تیرے آگے رنگ چہرہ پر کہاں ان کے مگر   خجلت مفرط سے روئے دلبراں ہوجائے سرخ
شدت گریہ وہ اپنے دیدۂ خوں بار کی
گر بیاں کیجے تو اے راسخ زباں ہوجائے سرخ
رہِ حرف و سخن غم سے ہے یاں بند   رواں ہے اشک آنکھوں سے زباں بند
دل اپنا وا ہو تم اپنی قبا کے   اگر کھلواؤ ہم سے مہرباں بند
ابھی تو ہے چمن میں چشم گل باز   در گلشن نہ کر اے باغباں بند
نہیں کہتا مرا حال اس سے کوئی   ہوئی گویا زبان دوستاں بند
کہاں ہے دیدنی طور زمانہ
رکھو راسخ تم آنکھیں ہر زماں بند

☆☆

تا خوابِ مرگ ذکر تھا ان کا زباں پر   نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر

نازاں ہوں اپنے قلب شکستہ کی شان پر   ہے عرش کو حسد اسی ٹوٹے مکان پر
بازاریانِ عشق کی ہے طرفہ رسم و راہ   وابستہ آہ سود ہے ان کا زیان پر
اپنا بھی ماجرائے دل اک مرثیہ سا ہے   بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر
یک بارہ دل ہوائے دو عالم سے اٹھ گیا   بیٹھے ہم آن کر جو ترے آستان پر
جی میں ہنوز پھرتے ہیں یارانِ رفتہ آہ   چشم دل اپنی باز ہے اس کاروان پر
راسخ یہ کیا ہے عشق کو بدنام مت کرو
عاشق ہو اور مرتے ہو نام و نشان پر

☆☆

کوچ ہے نزدیک ہم پابندِ غفلت ہیں ہنوز   اس سرا میں آرزو مند اقامت ہیں ہنوز
پیری آئی پر جُنوں کا ہے وہی عہدِ شباب   ویسے ہی ہم موردِ سنگ ملامت ہیں ہنوز
ابتدائے عاشقی سے عاشق اس بے رحم کے   مبتلائے ابتلا و رنج و کلفت ہیں ہنوز
ان کی سوزش میں کمی آئی نہ زیر خاک بھی   داغ دل محسود خورشید قیامت ہیں ہنوز
محو ہیں عشق مجازی ہی کے راسخ اب تلک
ہم نے سیر ان کو کیا وے بے حقیقت ہیں ہنوز

☆☆

لامکاں تک آہ رکھتے ہیں رسائی کی ہوس   پہنچے ہے کیا دور اس تیر ہوائی کی ہوس
در پر اپنے دیکھ میرا بسترا کہنے لگے   اس گدا کو ہے ابھی بخت آزمائی کی ہوس
جرم فرضی پر لڑا کرتے تھے وے کس لطف سے   ہائے رے وے لطف پھر ہے اس لڑائی کی ہوس
بوریا پوشی نے تہہ کر رکھیں وے سب خواہشیں   ورنہ کیا کیا تھی ہمیں بھی میرزائی کی ہوس
منزلت پائی نہ قرب آستان یار کی   کتنے زیر خاک لے گئے جبہ سائی کی ہوس
راسخ اے بے شرم اے بے درد اے ننگ وفا
ہے تجھے دل کی اسیری سے رہائی کی ہوس

☆☆

کیا یار ہے اب مجھ جگر افگار سے ناخوش   اے وائے طبیب اب تو ہے بیمار سے ناخوش

تم بن مجھے غم خانہ خوش آتا نہیں اپنا   کلفت کے سبب ہوں در و دیوار سے ناخوش
تصویر کے غنچے کی روش بند ہے دل آہ   کیوں کر نہ ہوں سیر گل و گلزار سے ناخوش
اس چہرۂ زیبا کے نتائج سے ہے حیرت   کیوں ہوتے ہو وارفتۂ رفتار سے ناخوش
راسخ ہیں عجب عاشق معشوق طبیعت
تعظیم اگر بھولے تو ہوں یار سے ناخوش

☆☆

دیدہ و دل میں ہے ان کے جائے حرص   اہل عالم کتنے ہیں شیدائے حرص
داغ محرومی سوا یاں کیا اُگے   طرفہ شورستان ہے صحرائے حرص
ہاتھ داماں قناعت آچکا   درمیاں ہے جب تلک یہ پائے حرص
باب ذلت اس کے باعث ہم تو ہیں   در بدر پھرواتی ہے اے وائے حرص
کب تلک سرگشتہ پھریے راسخ آہ
کاش جاوے سر سے یہ سودائے حرص

☆☆

عاشق کو تیرے مسکن و ماوا سے کیا غرض   خلد و بہشت و کوثر و طوبیٰ سے کیا غرض
دیوانہ تیرے جلوۂ حیرت فزا کا ہوں   مجھ کو پری کے جلوۂ زیبا سے کیا غرض
مقصود ذکر یار ہے اس پردے میں مجھے   ورنہ حدیث لیلیٰ و عذرا سے کیا غرض
دنیا ہے جس کا نام سو باطن ہے شیخ کا   ظاہر میں گو کہیں ہیں کہ دنیا سے کیا غرض
کرتے نہیں دو رنگی کو راسخ پسند ہم
اس باغ کے ہمیں گل رعنا سے کیا غرض

☆☆

الم کش کو ہے الفت کیش سے ربط   کہ ہے دل ریش کو دل ریش سے ربط
نہیں آسودگان محنت سے مانوس   نہ ہو نوش آشنا کو نیش سے ربط
مآلِ کار سے جو بے خبر ہے   اسے کیا عاقبت اندیش سے ربط

ہوئے جو آشنا اس کے انھوں کو   نہ بیگانوں سے ہے نہ خویش سے ربط
شہوں کا ربط کام آیا نہ راسخ
کرو پیدا کسو درویش سے ربط

☆☆

غیر ہیں وصل یار سے محظوظ   ہم فقط انتظار سے محظوظ
پلکیں اس گل کی جی میں پھرتی ہیں   دل ہے اس خار خار سے محظوظ
بوالہوس ہیں نہیں، ہیں وے عاشق   ہیں جو بوس و کنار سے محظوظ
جن کے دل رک رہے ہیں وے کب ہوں   سیر باغ و بہار سے محظوظ
نالۂ دل کے رفتہ ہیں راسخ
نہیں صوتِ ہزار سے محظوظ

☆☆

سارے اوباش رہتے ہیں واں جمع   کیا ہو اپنا دل پریشاں جمع
پر شیاطین ہی سے ہے اب تو جہاں   جہاں دیکھو ہیں کتنے شیطان جمع
اس سرا میں تو تفرقہ ہی رہا   خاطر اپنی کبھو نہ ہوئی یاں جمع
ہم کہیں تھے طبیب اپنا کہیں   نہ ہوئے حیف درد درماں جمع
مرجع شاعراں ہیں راسخ تو
رہتے ہیں ان کے یاں سخنداں جمع

☆☆

کہتا ہے کیوں عبث عبث اے نامہ بر دروغ   وہ اور ہم تلک آوے نگہ اس قدر دروغ
اکثر ہے یہ کہ جھوٹے ہی ہوتے ہیں کامیاب   جاتا ہے پیش راستی سے بیشتر دروغ
شیخ دروغ مصلحت آمیز خوب ہے   آنے کی اس کے دو مجھے یارو خبر دروغ
کیا عہد ہے کہ سچے کو احمق کہے ہے خلق   دانا وہی ہے اب جو کہے سر بسر دروغ
ہو رفتہ فن شعر کے راسخ تم ایسے کیوں

حسن اس میں اور کچھ تو نہیں مگر دروغ

☆☆

اب تو ہیں ہائے وے کرم موقوف   خط و پیغام یک قلم موقوف
لطف کیا قہر کا بھی صرفہ ہے   یہ ستم ہے کہ ہے ستم موقوف
ہیں مقیم دل سے اپنے حزن و ملال   نہ ہوئے بود و باش غم موقوف
غیر سے اختلاط ہے ہر آن   نہیں وے لطف دم بہ دم موقوف
ہے یہی وجہ آبرو راسخ
کیوں کریں شغل گریہ ہم موقوف

☆☆

عشق کا ہو رہ کہ دل سب سے اٹھا دیتا ہے عشق   عقل کے الجھاؤ سے دم میں چھڑا دیتا ہے عشق
عاشق و معشوق فرضی آنے لگتے ہیں نظر   عاقبت پردے تعین کا اٹھا دیتا ہے عشق
کر دیا اس نے تو ابراہیم ادہم کو فقیر   آن میں گھر بادشاہوں کے لٹا دیتا ہے عشق
آسماں پر ہے غرور و عُجب سے جن کا دماغ   دفعتاً ان کا زمیں سے سر لگا دیتا ہے عشق
راسخ ان کی آنکھ پڑتی ہے دو عالم پر کہاں
عاشقوں کو اور ہی عالم دکھا دیتا ہے عشق

☆☆

کوہ کن نہ کوہ میں نہ قیس تھا بن میں شریک   ہوسکا کوئی نہ میرا عشق کے فن میں شریک
کر دیا پتھر کو موم، آہن کو آب، اک آن میں   ہے اثر نالوں کا میرے سنگ وآہن میں شریک
روشنی پکڑے چراغ خانۂ معشوق کب   خون عاشق جب تلک ہووے نہ روغن میں شریک
کفر و دیں کو ایک ہی سمجھو حقیقت میں کہ ہے   رشتۂ تسبیح زنار برہمن میں شریک
دوست ہی تنہا نہ ماتم دار راسخ کے ہوئے
ہوگئے دشمن بھی آ کر اس کے شیون میں شریک

☆☆

یوں جگر نے لی دلِ پُر داغ پر آذر سے آگ   لاوے جوں ہمسایہ، ہمسائے کے جا کر گھر سے آگ

وہ سراپا سوختہ ہوں عشق کی آتش کا میں   کرتی ہے دریوزہ گری جس کی خاکستر سے آگ
آہ سوزاں نے مری کھینچا ہے سرتا آسماں   کیا عجب ہے گر زمیں پر آسماں سے برسے آگ
کیوں نہ ہو بھسمنت اپنا مزرع آتش نصیب   جائے آب اس کشت پر برسے ہے ابرِ تر سے آگ

جسم سوزاں کی تپ دوری سے حالت کیا کہوں
ہے قریب اب یہ بھڑک اٹھے مرے بستر سے آگ

☆☆

سنایا اس کو گر حال دل پُر درد، کیا حاصل   دکھایا گو یہ اشک سرخ و رنگ زرد، کیا حاصل
وہ آئینہ میں محو اپنا، نظر کیا ہو ادھر اس کی   گئے گر پاس اس کے مل کے منہ پر گرد، کیا حاصل
نگاہِ گرم سے کیا لطف، گر دیکھا ادھر اس نے   حضور اس کے جو کھینچی ہم نے آہ سرد کیا حاصل
کہے ہے لولیٔ دنیا کہ ہوں میں مرد کی طالب   اگر طالب ہوا میرا کوئی نامرد، کیا حاصل

کہاں تک شوق شعر و شاعری پیری میں اے راسخ
کہی تم نے غزل یا مثنوی یا فرد، کیا حاصل

☆☆

سر سے پا تک وفا ہوئے ہو تم   کسو پر مبتلا ہوئے ہو تم
عذر خواہی کا اب دماغ نہیں   خوش رہو گر خفا ہوئے ہو تم
خاک چھنوا کے ہاتھ آتے ہو   نسخۂ کیمیا ہوئے ہو تم
آپ سے ہوگئے ہیں بیگانے   جن سے ٹک آشنا ہوئے ہو تم
گل رُخاں ہیں تمہارے محو ادا   ایسے رنگیں ادا ہوئے ہو تم
پھرتے ہو گھر گھر آئینہ کی مثال   کس قدر خود نما ہوئے ہو تم
دیکھ خوباں بھی تم کو جا سے گئے   رشک خوباں بجا ہوئے ہو تم
حسن والوں میں کون ہے تم سا   قہر، آفت، بلا ہوئے ہو تم

جاتے ہو ہر دم آپ سے راسخ
کیا کسو سے جدا ہوئے ہو تم

☆☆

راستی یہ ہے کہ آمر نہیں مامور ہوں میں   اس پہ مختار کہو مجھ کو تو مجبور ہوں میں
دل بہت سخت تھا میرا سو گداز اس کو کیا   کیمیا ساز محبت کا تو مشکور ہوں میں
جستجو میں مری مت اتنی پریشاں ہو کہ آہ   تجھ سے صد بادیہ اے صوت جرس دور ہوں میں
انتہا عشق کی یہ ہے کہ ہو عاشق معشوق   آخر اب اپنے ہی منظور کا منظور ہوں میں
عُجب افزوں مرا شاہوں سے ہے پر ہوں درویش   نہ سکندر ہوں نہ دارا ہوں نہ فغفور ہوں میں
اس دل سوختہ کی یہ جو ہے ایک چٹکی راکھ   زور شئے ہے اسی اکسیر پہ مغرور ہوں میں

نقطہ ہوں دائرۂ چرخ کا گویا راسخ
کیوں کر اس دائرہ سے نکلوں کہ محصور ہوں میں

☆☆

وسعت شہر تھی اک گوشۂ زنداں مجھ کو   لے گئی وحشت دل سوئے بیاباں مجھ کو
میرے در پے نہ ہو کیا جانوں کہاں ہوں میں آہ   تفرقہ یاروں کا رکھتا ہے پریشاں مجھ کو
ہوں تصور میں کسو دست نگاریں کے میں آہ   بھاوے کس رنگ بھلا پنجۂ مرجاں مجھ کو
رہتے ہیں میرے اب زخم ہمیشہ خنداں   چرخ نے طرفہ دیئے ہیں اب خنداں مجھ کو
پیش ازیں وے جو مرے رونے پہ چشمک زن تھے   آنسو بھر لاتے ہیں اب دیکھ کے گریاں مجھ کو

راہ دشوار سخن کا ہوں بلد اے راسخ
رہنما جانتے ہیں اپنا سخن داں مجھ کو

☆☆

شرکت سحر ہے طرز نگہ یار کے ساتھ   مار رکھا اسے، دیکھا جسے ٹک پیار کے ساتھ
ہے سبب طول امل کا یہی اک تار نفس   سارے الجھاؤ ہیں وابستہ اسی تار کے ساتھ
قابلیت کی ہے تشخیص قیامت یہ ہے   حشر منسوب تو ہے وعدۂ دیدار کے ساتھ
خوب و زشت چمن دہر کا صانع ہے ایک   انس یاں ہم کو مساوی ہے گل و خار کے ساتھ
کس قدر بو قلموں جلوہ ہے اپنا محبوب   کوئی بھی اس کی تجلی نہیں تکرار کے ساتھ

وہ تو پابند وفا ہے نہ لڑو راسخؔ سے
ہر دم الجھا نہ کرو اپنے گرفتار کے ساتھ

☆☆

اس حدیقہ میں تو ہم آکے سبک بار رہے
بوئے گل کی سی روش چلنے کو تیار رہے

شوق چاہے ہے کہ بے پردہ رخ یار رہے
گو نہ موسیٰ کی طرح طاقت دیدار رہے

مصرفِ خندۂ بے جا ہوئی اوقات عزیز
اب ہمیں رونے سے کیوں کر نہ سروکار رہے

ایک رقعہ بھی نہ آیا کبھی اس نوخط کا
ہم اُدھر سینکڑوں ہی بھیجتے طومار رہے

ہے اسیران محبت کی رہائی دشوار
ہائے یہ لوگ تو مر کر بھی گرفتار رہے

عشق اک حاکم جابر ہے اگر حکم کرے
دیر میں شیخ حرم باندھ کے زنار رہے

نہ رہے نقش کے وارفتہ و شیدا راسخؔ
نقش پرداز ہی کے وے تو طلبگار رہے

منتخب اشعار

سمجھیو سہل نہ تو نالۂ خمیدہ قداں
کہ پار عرش کے یہ اس کماں کا تیر ہوا

نسبت تو درست کر کسو سے
تا دل نہ ہو بے حضور تیرا

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارا ہے

برق سے پوچھا کہ شادی کتنی اس عالم کی ہے
کچھ کہا اس نے نہ لیکن اک تبسم سا کیا

لاگ اس پلک کی اتنی تو معلوم ہے کہ آہ
کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

غفلت میں کٹی عمر نہ ہشیار ہوئے ہم
سوتے ہی رہے آہ، نہ بیدار ہوئے ہم

سارے خطِ شوق میں، میں نے یہی رو رو لکھا
ہائے صاحب کیا کیا تم نے، جدا تم کیوں ہوئے

لذتیں غم کی تیرے ہو جیو راسخؔ پہ حرام
دل میں کچھ اور اگر غم کے سوا رکھتا ہے

رخِ زیبا دیا گل کو ، دلِ بے صبر بلبل کو
اسے خنداں کیا پیدا، اسے گریاں کیا پیدا

میری متاع عجز بھی کی ناپسند ہائے
بولے کہ اس متاع پہ تجھ کو غرور تھا

تم نے راسخؔ تنِ عریاں پہ جو توڑے ناخن
کیا نمک پاشی کا اس شوخ نے اقرار کیا

کہاں کی لیلیٰ و مجنوں یہ اسمائے فرضی ہیں
مسمیٰ اور ہی شئے تھا نہ لیلیٰ اور مجنوں تھا

چراغ خانہ مت سمجھو، چراغ عشق کو راسخؔ
کہ اس میں چاہئے روغن، پر اس میں خون تمنا کا

فردوس سے وہ نکلا، میں کوچۂ جاناں سے
رونے کو مرے پہنچا، رونا کہاں آدم کا

مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا
دید کو اپنی یہ آئینہ اسے درکار تھا

مت پوچھئے مجھ سے حال میرا
حیرت زدہ کیا بیاں کرے گا

طالبانِ یارکی منزل تو غیر از دل نہیں
کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہے منزل نہیں

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تلک بھی آج بہت گھبراتا ہے

قطع رہِ دشوار محبت نہیں آساں
پیش آوے یہاں مسئلہ تسلیم و رضا کا

امتحاں مخصوصِ خاصاں ہے تو راسخ شکر کر
یار تیرے آزمانے کی طرف مائل ہوا

دل ہوس والوں کو محروم اس کے پرتو سے رہے
جلوہ گاہ داغ جاناں سینۂ ابرار تھا

خاک ہوں پر توتیا ہوں چشم مہر و ماہ کا
آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبار راہ کا

کس قدر بو قلموں جلوہ ہے محبوب اپنا
کوئی بھی اس کی تجلی نہیں تکرار کے ساتھ

ہے کار گاہِ دلکش عالم عجب جگہ
بیکار یاں رہا نہ کرو ، کچھ کیا کرو

روز محشر کی درازی تو ہے کوتاہ بہت
کس سے نسبت دوں میں طولِ شب تنہائی کو

جو داغ ہے کیا دلِ حزیں میں
لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں

ہوں طائر باغ قدس راسخ
تا عرش ہے میری اک پرواز

آرام سے وہی ہیں، دل آسودہ جو کہ ہیں
رکھتے ہیں ہائے ہم تو دل بے قرار پاس

عرش عظیم کا بھی کیا ہم نے خوب سیر
دل کی سی وسعت اس میں نہیں، یہ مکاں ہے اور

ہوں مردم افسردہ و دلگیر کی مانند
اس بزم میں حیرت زدہ تصویر کی مانند

غنچۂ گل کیوں گریباں چاک رکھتا ہے صبا
کس کے غم میں صبح تک روتی ہے شبنم شام سے

سراسر نقش یہ صفحہ، عبارت ہے جہاں جس سے
ہے آئینہ رخِ نقاش کا گر چشم بینا ہو

مسافرانہ رہے ہم جہاں میں راسخ
لگایا ہم نے تو قصداً نہ اس سرا سے دل

گیا حسن تس پر بھی ہیں ایک آفت
مجھے عشق ہے ان کی صورت سے اب تک

شانِ کریمی اُن کی ہے برسرِ عنایت
کیا رتبہ ورنہ میرا، کیا مجھ گدا کی خواہش

رباعیات

انسان ہی کا دل نہیں تری خلوت گاہ
ہر چشم کو ہے ظہور سے تیرے راہ
کس کس قالب میں جلوہ فرما ہے تو
کیا کیا ہیں ترے لباس اللہ اللہ

☆☆

جس عاصی پہ تیری نظر رحمت ہو
کب روز قیامت کی اسے دہشت ہو
تو برسر بخشش ہو تو پھر فاسق بھی
بے پرسش جرم، داخل جنت ہو

☆☆

ٹکڑے ٹکڑے جگر ہوا جاتا ہے
جی کا اپنے ضرر ہوا جاتا ہے
افسانہ وہ مہ سنے ہے واں راتوں کو
یاں قصہ ہی مختصر ہوا جاتا ہے

☆☆

غم تیرا کسو کو کب سناتا ہوں میں
اس راز کو کب زباں پہ لاتا ہوں میں
کہنے نہیں دیتی مجھے یہ غیرت عشق
دل سے بھی ترا درد چھپاتا ہوں میں

☆☆

راسخ تبہ احوال رہوگے کب تک
یوں محو خط و خال رہوگے کب تک
پیری آئی، گئی جوانی صاحب
بازیچۂ اطفال رہوگے کب تک

☆☆

دیکھی فقط آرائش دنیا تم نے
پیدا نہ کیا دیدۂ بینا تم نے
مصروف تماشائے چمن ہی رہے آہ
راسخ جمن آرا کو نہ دیکھا تم نے

☆☆

کیا حسن عدالت ہے یہ اے ذی تکمیل
سرتاسر شخصِ دہر ہے جس سے جمیل
ظالم کا وجود اب کہیں ہے تو وہ ہے
انگشت ششم کی طرح بے وقر و ذلیل

☆☆

دن ہو پردوں میں رات پردوں میں ہو
کچھ جھوٹ نہیں یہ بات پردوں میں ہو
دشوار ہے دیکھنی تمہاری صورت
آنکھوں میں ہو میری سات پردوں میں ہو

☆☆

بے داد فلک سے تنگ آہ آیا ہوں
تجھ پاس بہ احوال تباہ آیا ہوں
اے داور عادل مری فریاد کو سن
انصاف طلب ہوں داد خواہ آیا ہوں

☆☆

یارب نہ کرے گردشِ گردوں پامال
آفات سے محفوظ رہوں میں مہ و سال
ہوں دائرۂ حفظ میں تیرے، مجھ کو
تو دائرہ حفظ سے اپنے نہ نکال

☆☆

ہے دشمنِ جاں چرخِ ستم گر میرا
دل ہے گردش سے اس کی مضطر میرا
تا منزل مقصود نہ پہنچوں ہرگز
گر لطف تیرا نہ ہووے رہبر میرا

☆☆

گر مورد بخشش نہ ہو تیرا راسخ
کس طرح کرے عزم وطن کا راسخ
اس کی تو بساط ہیں کئی گوہر اشک
کچھ اور گرہ میں نہیں رکھتا راسخ

☆☆

مشاق کو اپنے ہائے ترساتے ہو
پردہ کرتے ہو مجھ سے شرماتے ہو
ظاہر میں تو سامنے نہیں آتے کبھو
دل میں ہر لحظہ کیوں چلے آتے ہو

☆☆

پیری ہے نہیں یہ وقت کھونے کے دن
ہنستے کیا ہو کہ ہیں گے رونے کے دن
اس جاگنے کو جانو غنیمت راسخ
نزدیک بہت ہیں دیر سونے کے دن

مثنوی ناز و نیاز

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے   کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے
اس سے رو صدمہ کش ناخن ہیں   کاوش اس کی جگر خوں کن ہیں
جی ہوا ضعف کی منزل اس سے   ناتوانی ہے قوی دل اس سے
ہیں عجب اس کے تصرف کے ڈھنگ   موم سے نرم کئے ان نے سنگ
اس کے دلہائے شکستہ ہیں باب   ہے یہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی شراب
عشق کو ساز ہے غم ناکی سے   عہد و پیوند جگر چاکی سے
عشق میں ہوتی ہیں آنکھیں ناسور   رونے کڑھنے ہی کا یاں دستور
پنجۂ غم کے نچوڑے ہوئے دل   ہیں اس آفت کے مقام و منزل
سوز سے رکھتے ہیں جو ہر دم ساز   بیشتر ہے یہ انہوں کا دم ساز
پیار محزونوں ہی کو کرتا ہے   چوٹ کھائے ہوں پر مرتا ہے
عشق میں شرط ہے چشم گریاں   آبرو رونے سے پاتے ہیں یاں
عاشقی مایۂ ناکامی ہے   وجہ رسوائی و بدنامی ہے
عشق کی مجھ سے نہ پوچھو کچھ بات   عشق سے بامزہ ہے موت و حیات
ہے نہ جینا ہی حلاوت کے ساتھ   مرگ بھی اس میں ہے لذت کے ساتھ
عشق میں لوگوں نے جانیں دی ہیں   تلخیاں عشق کی کیا شیریں ہیں
عشق کا رنج ہے راحت کا رشک   اس کی تلخی ہے حلاوت کا رشک

قطعہ

عشق سمجھو تو عجب کچھ ہے چیز
درد و داغ اس کے بھی کتنے ہیں عزیز

ایک ہی دل میں چھپا رکھنے کی گوں
ایک چھاتی سے لگا رکھنے کی گوں

عاقلوں سے ہے بہت عشق نفور
عقل سمجھے اسے کب ہے یہ شعور

ان سے جو وحشی ہیں مانوس ہے عشق
آتش خرمن ناموس ہے عشق

یار اس کے سبھی سودائی ہیں
ساکن کوچۂ رسوائی ہیں

ان کا سامان ہے بے سامانی
تن پہ ہے پیرہن عریانی

پیرہن کے نہیں پابند اسیر
کفنی پھاڑتے ہیں اس کے فقیر

کارپرداز جنوں ہے اس کا
محرم راز جنوں ہے اس کا

کچھ لباسی نہیں زیبائی عشق
خاک ہے جامۂ رعنائی عشق

ربط رکھتاہے یہ دیوانوں سے
راہ اسے چاک گریبانوں سے

عشق کا مرتبہ ہے بسکہ بسیط
کب قیاس و خرد اس پر ہوں محیط

جس نے کچھ بھی اسے پہچانا ہے
وہ سڑی، خبطی ہے دیوانا ہے

دیکھے کفنی سے ہم اس کے محرم
رفتگی سی رہے ان کو ہر دم

لاگوں اس کے متحیر پائے
وے گئے گذرے ادھر جو آئے

لاگ سے اس کی بروگی ہوئے لوگ
جوگ لینے گئے جوگی ہوئے لوگ

چھاتیاں سوز سے اس کے مجمر
دل کئے آگ نے اس کی اخگر

سرخ چہرے کئے ہیں زرد اس نے
کیں ہیں پیشانیاں پر گرد اس نے

کچھ عجب شعلہ سرکش ہے یہ
ایک پرکالۂ آتش ہے یہ

گرمیاں اس کی پگھلا دیتی ہیں
سنگ کو موم بنا دیتی ہیں

درد سے اس کے جو محزوں ہووے
وہ یہی چاہے کہ افزوں ہووے

آنکھیں اس عشق میں بھر آتی ہیں
صورتیں اس سے بگڑ جاتی ہے

سر کی عریانی اسی کے ہاتھوں
مو پریشانی اسی کے ہاتھوں

ہوش کا خانہ بر انداز ہے یہ
سحر پرداز و فسوں ساز ہے یہ

دشت و کہسار میں شور اس کا ہے
قیس و فرہاد کو زور اس کا ہے

موت ہم قدر حیات اس کے سبب
زہر محسود نبات اس کے سبب

گرچہ ہے چشم کا وجہ تخریب
علت روح کا ہے عشق طبیب

کنت و کنزاً ہے عبادت اس سے
میں کہوں اس کی حقیقت کس سے

لاگ والے ہی اسے جانتے ہیں
وہی کچھ جانتے پہچانتے ہیں

ہے زماں محرم اسرار اس کے
سب آزاد گرفتار اس کے

وجہ وارستگی ہے بند اس کا
سبب قطع ہے پیوند اس کا

عشق میں جیتے وہی جو ہارے
عشق اٹھاوے ہے تعین سارے

عشق طالب بھی ہے مطلوب بھی ہے
یہ محبّ ہے یہی محبوب بھی ہے

دل کو طومار وفا ان نے کیا
مخزن صدق و صفا ان نے کیا

سخت مشکل گذر اس کی ہے آہ
سر کو لے ہاتھ میں یاں جیتے ہیں واہ

بسکہ پا نغز ہے میداں اس کا
طرفہ مقتل ہے بیاباں اس کا

عشق دشت شہادت گہہ ہے
جانتا ہے وہی جو آگہہ ہے

یاں تڑپتے نہیں بسمل ہوکر
زخم ساں ہنستے ہیں گھائل ہوکر

کب ہے مقتول بیت کا خواہاں
دعویٰ قاتل کو پہنچتا ہے یہاں

خون امید سے یہ پر نیرنگ
بخشے ہے یاس کے چہرہ کو رنگ

اس سے پر آب سدا دیدہ تر
خندہ اسی کے سبب آتش بہ جگر

صبر بیتابی کا اس سے مغلوب
آہیں حسرت بھریں اس کی مرغوب

جمع دل اس سے پریشانی کا
وجہ صد آئینہ حیرانی کا

جن کو نیرنگ پر اس کے ہے نظر
ان کو حیرت زدہ دیکھا اکثر

اس کے وارفتوں کو محویت ہے
عشق اک زور ہے کیفیت ہے

ابتدا اس کی ہے گریاں رہنا
انتہا رفتہ و حیراں رہنا

نسخۂ حسن کا ہے یہ مفہوم
سارے عالم میں اسی کی ہے دھوم

عاشقی رنج و تعب محنت ہے
عاشقی ہائے بڑی آفت ہے

ایک جنجال ہے مائل ہونا
دو نگاہوں کا مقابل ہونا

کرتا ہے آنکھوں کا لڑنا ہی اسیر
لاگ حلقوں کی بہم ہے زنجیر

جاں زباں ہے یہ محبت کا دام
بدلا ہے یہ محبت کا دام

کوئی چھوٹا نہیں پھنس کر اس میں
جانیں جاتی ہیں ترس کر اس میں

عاشقی مایۂ صید خواری ہے
عاشقی دل کی گرفتاری ہے

عاشقی ہے عجب اک جی کا روگ
ان نے تو چن کے بنائے ہیں لوگ

عاشقوں میں متلون ہیں حال
کوئی خاموش کوئی گرم مقال

عاشقی شوق ہے کچھ مت پوچھو
ہمگی ذوق ہے کچھ مت پوچھو

کیا بتاؤں جو مزا ہے اس کا
کیا کہوں ذائقہ کیا ہے اس کا

جس نے چکھا ہی نہ وہ کیا جانے
چکھنے والا مزا اس کا جانے

عشق اک لذت روحانی ہے
عشق کیفیت وجدانی ہے

ہے مزا اس کا بیاں سے باہر
عقل سے وہم و گماں سے باہر

عشق میں طینت اضداد ہے ایک
رتبۂ خسرو، فرہاد ہے ایک

رفتہ کا اس کے طریقہ کرے ہے پامال
ہے پرے وہم سے یہ تازہ خیال

تم روش آہ نہ پوچھو اس کی
جانے دو راہ نہ پوچھو اس کی

راہ میں اس کی وفا کے پابند
مٹتے ہیں نقش قدم کے مانند

خاک ارباب وفا ہوتے ہیں
آخر کار ہوا ہوتے ہیں

عیب عشاق خطر عشق میں ہے
جان دینا ہی ہنر عشق میں ہے

عشق میں ہجر بہت ہے جانکاہ
اس کے مارے ہوئے بچتے نہیں آہ

جن کو یہ مرحلہ آتا ہے پیش
جی سے جاتے ہیں گذر وے درویش

حکایت

اصمعی وہ ہمہ تن عجز و نیاز
دل تھا جس کا صدق گوہر راز

یوں ہے ناقل کہ پس از طئے راہ
وادیٔ کعبہ میں اک دن ناگاہ

ایک پتھر نظر آیا مجھ کو
اس کا کچھ دیکھنا بھایا مجھ کو

سطح سے اس کی صفا جاں افروز
رقم اس پر کئی بیتیں پُرسوز

ان کے مضموں سے ٹپکتا تھا خوں
یہی حسرت زدہ ان کا مضموں

کہ اے ملک مرتبہ حجاج کرام
عازم طوف در بیت حرام

ٹک ہے پاس دل بشکستہ ضرور
غافل اس سے نہ رہو تا مقدور

کعبۂ دل نہیں کعبہ سے کم
شرف کعبہ ہے پیش محرم

ہے جو ترتیب وہ عرش عظیم
سوہے ٹوٹے دل ہی کا مقیم

ہاں خبر لو کہ شکستہ دل ہوں
جگر افگار ہوں خستہ دل ہوں

دل و جاں سے ہو فدا اے کعبہ
تم کو سوگند خدائے کعبہ

پوچھو ہوں تم سے میں آفت دیدہ
کہ کوئی غم زدہ دل رنجیدہ

کہ کہیں آنکھ لڑا بیٹھا ہو
دل پہ کچھ چوٹ سی کھا بیٹھا ہو

کسوکے دیکھ حنا بستہ بات
پس گیا ہووے حنا سا ہیہات

پر فسوں آنکھ کو ہو دیوانا
گلی کوچوں میں بنے افسانا

ہو کسو زلف کا سودا اس کو
کسو کاکل کی تمنا اس کو

دل کا ہووے کسو گیسو سے لگاؤ
سلجھے بالوں سے کسوکے الجھاؤ

قطعہ

جعد مشکیں نے کسو دلکش کے　　لپٹے بالوں میں کسو مہہ وش کے
قصہ کوتاہ کیا ہو اس کا　　دل سیہ آہ کیا ہو اس کا
دل کہیں اس نے لگایا ہووے　　پیچ میں زلفوں کے آیا ہووے
قید غم سے رہائی ہو اسے　　اپنے دلبر سے جدائی ہو اسے
حد سے گذری ہو گرفتاری دل　　طول کو پہنچی ہو بیماریٔ دل
اس گرفتار کی کیا ہے تدبیر　　ایسے بیمار کی کیا ہے تدبیر
سمجھا ان بیتوں کا حاصل میں نے　　پائے راقم کے تہ دل میں نے
کرکے موزوں کئی بیتیں اس دم　　کیں اسی سنگ پہ یوں میں نے رقم
کہ کوئی گر کہیں مائل ہووے　　عشق کے صدموں کا حامل ہووے
واجب اس پر ہے اگرچہ ہو جبر　　ہاتھ سے دیوے نہ سر رشتہ صبر
ہمہ غم ہووے ولیکن رہے شاد　　دے ہم نے ناموس محبت برباد
حشر فریاد سے برپا نہ کرے　　عشق کے راز کو رسوا نہ کرے
ضبط آہیں کرے روکے نالے　　آمد گریہ کو ہنس کر ٹالے
بے تہی سے نہ رہے گرم خروش　　جیسے تصویر سدا ہو خاموش
چاک کرنے سے گریباں کے ڈرے　　راز پوشیدہ نہ بے پردہ کرے
رفتگی گر ہو پہ ہشیار رہے　　بے خبر ہوکے خبردار رہے
سرزمیں عشق کی پا لغز ہے آہ　　ہو نہ لغزش کرے یوں قطع راہ
جان دے آنکھوں میں بے خوابی کو　　ضبط کرتا رہے بیتابی کو
لکھ یہ ابیات ہوا واں سے رواں　　پہنچا منزل کو میں اپنی حیراں
حیرت افزا تھی روداد عجیب　　تھا تحیر کہ وہ مہجور غریب
کس کا اس درجہ تمنائی ہے　　کس طرف ہائے وہ شیدائی ہے

شب اسی فکر میں بے خواب رہا　　تا دم صبح میں بیتاب رہا
صبح کے ہوتے نہ کی ٹک بھی درنگ　　پا برہنہ ہے کب تا سرسنگ
سطح پر سنگ کے، کی جو میں نگاہ　　اپنی تحریر کے نیچے کچھ آہ
تازہ بیتیں لکھی دیکھیں دو چار　　ان کا مضمون یہ تھا کہ اے غمخوار
صبر سے ہووے ہے مشکل آساں　　پر جہاں عشق ہے واں صبر کہاں
صبر صد مرحلہ ہے عشق سے دور　　وہ تو عاشق نہیں جو ہووے صبور
لذتیں عشق کی ہیں اس پہ حرام　　عشق میں صبر کا جو لیوے نام
عرصہ بے صبری سے جس پر ہے تنگ　　عاشقوں کی ہے وہ مجلس کا ننگ
صبر ہے پنبہ و آتش ہے عشق　　آہ اک شعلہ سرکش ہے عشق
صدمۂ عشق کہاں صبر اٹھائے　　کاہ کب کوہ کے عہدے سے بر آئے
جو سپند سر آتش ہووے　　تب ہجراں کا تعب کش ہووے
آہ وہ حسرتی سیرابی　　کیا کرے گر نہ کرے بیتابی
صبر کا عشق میں ٹھہرے نہ قدم　　ہو کہاں آتش و سیماب بہم
عشق تو صبر کا کھینچے ہے پوست　　عشق ہے صبر کا دشمن اے دوست
عشق میں صبر سے ہیں جو منسوب　　سہل ہے ان کو فراق محبوب
جس کا بے صبری جگر پارہ کرے　　کیا دوا اس کی وہ بیچارہ کرے
خوں چکاں جو ہیں پڑھے یہ اشعار　　ہوئیں آنکھیں مری وہیں خونبار
ان کے مفہوم نے بیتاب کیا　　زہرۂ طاقت دل آب کیا
پھر اسی سنگ پہ ہیں از سر درد　　گرم تحریر ہوا بھر دم سرد
کہ کوئی دل زدہ مہجور و غریب　　نیم کشتہ الم و ہجر نصیب
تعب ہجر سے ہو بے طاقت　　صبر پر اس کو نہ ہووے قدرت
تعب ہجر سے ہو بے طاقت　　صبر پر اس کو نہ ہووے قدرت
تنگیٔ حوصلہ سے گھبراوے　　مصلحت یہ ہے کہ وہ مرجاوے

شکر جو رنج و بلا پر نہ کرے   صبر جو جور و جفا پر نہ کرے
دوریٔ یار ہو ناساز مزاج   اپنے نزدیک ہے مرگ اس کا علاج
ابتلا عشق کی جو سہہ نہ سکے   ثابت اس راہ میں جو رہ نہ سکے
جس کو بیتاب رکھے درد فراق   عشق میں ہووے شکیبائی شاق
صبر کے کام میں گر ہووے خام   بارے اپنا ہی کرے کام تمام
جس کا ٹھہرے ہے نہ اس رہ میں قدم   چاہئے اس کو کہ لے راہ عدم
کار تحریر سے فارغ ہوکر   اپنی منزل کو گیا میں رو کر
رات ساری مجھے گریاں گذری   گذری پر سخت پریشاں گذری
صبح جانے میں نہ کی کوتاہی   پھر سوئے سنگ ہوا میں راہی
واں جو پہنچا تو گئے میرے حواس   دیکھتا کیاں ہوں کہ اس سنگ کے پاس
ایک نازک تن و رعنا سا جواں   ہے پڑا خاک پہ لیکن بے جاں
رنگ رخسار کا اس کے کاہی   سینہ نوچا ہوا پشت ماہی
روئے خوب آفتیٔ ناخن تیز   بدر کامل مہہ نو سے لبریز
جدول اک خون کی ہر تازہ خراش   سر پنہان محبت سب فاش
بیکسی لاش پر اس کی گریاں   حسرتیں سینہ زن و نوحہ کناں
آرزو منہ پہ ملے اپنے خاک   چاؤ ارمان گریباں کئے چاک
تنگی سے ہائے تمنائے وصل   پابرہنہ الم و حزن و ملال
فرق پر اپنے وفا خاک افشاں   بال نوچے ہوئے محزوں گریاں
مو پریشان امیدوں کی صف   ہائے افسوس کناں کف بر کف
صبر کے تن پہ فقیری کا لباس   غم غمِ بیکسی سے اپنی اداس
درد کو اس کے نہ ماتم سے فراغ   داغ کرتے تھے سیہ پوشی داغ

دفن نمودن اصمعی آں شہید تیغ استغنائے معشوق را و خاتمہ

دیکھ یہ رنگ عجب رنگ ہوا   عرصہ بیتابیوں سے تنگ ہوا

میں ہوا بسکہ غموں کا مغلوب   گلے اس لاش کے لگ رویا خوب
دفن اس کا ہوا واجب مجھ پر   زیر خاک اس کو رکھا رو رو کر
فارغ اس کام سے ہوکر دلخواہ   پھر جو اس سنگ پہ کی جاکے نگاہ
نظر آئے مجھے تھے گرچہ بعید   تحت ابیات یہ دو شعر جدید
شعر اول کے یہ معنی میں خروش   بات تیری ہوئی آویزہ گوش
تونے مرنے کو مجھے فرمایا   تیرا ارشاد بجا میں لایا
زندگانی تھی مری یہ مرنا   فرض تھا تیری اطاعت کرنا
کر اب اس تک مرا ابلاغ سلام   وصل کا اپنے جو مانع تھا مدام
کہہ طرف سے مرے یوں کہ اے طناز   تو زہے اور زہے تیرا ناز
جی گیا میرا غموں کے مارے   کیا گیا ناز کا تیرے بارے
میں تو اے وائے بہر حال موا   پر خجل تیری تمنا سے ہوا
وصل کا مژدہ کہا تھا اس کو   ہائے یہ وعدہ دیا تھا اس کو
میں تمنا کو تری کھو نہ سکا   ہائے پر تجھ سے بھی یہ ہو نہ سکا
گرچہ کہنے کو کیا ہو نہ سکا   یعنی یہ وعدہ وفا ہو نہ سکا
اب خجالت سے سر افگندہ ہوں میں   آرزو سے تری شرمندہ ہوں میں
کاش یہ وعدہ نہ اس سے کرتا   کاہے کو منفعلانہ مرتا
کاش کرتا تو مرے دل سے کہیں   محو اس تیری تمنا کے تئیں
اے مقیم دل اصحاب کمال   اک یہی تھا مری قدرت سے محال
دل کو میرے کیا اس شعر نے خوں   شعر ثانی کا یہی تھا مضموں
کہ خوشا طالع ارباب نعیم   نعمتیں جن کو ہوئی ہیں تقسیم
عاشقوں کو نہیں پر کچھ بھی تلاش   ان کی تو خون جگر پر ہے معاش
ہو مبارک انہیں خوش دل جینا   ان کو غم کھانا لہو کا پینا
اس کے ادراک سے بھر آئے اشک   آنکھیں میری ہوئیں ناسور کی رشک

مدتوں میں نے تو یہ غم رکھا
کشتۂ عشق کا ماتم رکھا

زہے یہ عشق سراپا نیرنگ
کیا کہوں اس کے ہیں کیا کیا نئے رنگ

اس کے وارفتہ تو محنت کش ہیں
مدعی اس کے مصیبت کش ہیں

داغ نیرنگ ہیں اس کے عاقل
یہ وہ ہے جس کا ہے حیرت حاصل

عقل والے ہیں دیوانے اس کے
حیرت افزا ہیں فسانے اس کے

خانہ ویرانوں کا دم ساز ہے عشق
آہ کیا خانہ بر انداز ہے عشق

اس سے دل جمع نہ فرزانوں کا
گھر نہ در اس کے پریشانوں کا

دل جلے اس کے ہیں ظاہر میں بھلے
باطناً راکھ کی ڈھیری ہیں ولے

پس رہے ہیں کوئی آگاہ نہیں
قیمہ ہیں لب پہ ولے آہ نہیں

مت کرو عشق کا دعوا راسخ
عشق تم کو نہیں زیبا راسخ

رنج کش عشق کے کب ہو صاحب
تم تو آرام طلب ہو صاحب

سایہ ہی ڈھونڈو ہو سونے کے لئے
دل خوش چاہو ہو زمانے کے لئے

زعفرانی ہے گلے میں کفنی
رنگ یہ کیا ہے، یہ کیا جی میں ٹھنی

ہو اگر عشق کے تم در کے فقیر
تو مناسب نہیں حاجت تذویر

باندھو اپنے سر عریاں سے کفن
کرو عریانی کو اب پیراہن

تن خاکی پہ نہ یوں جی توڑو
اس کف خاک کی الفت چھوڑو

اک کف خاک کی زیبائش کیا
اس کی یہ حسرت آرائش کیا

رہ اب اے خامۂ جادو تحریر
بیشتر ہے یہ تری تندِ صریر

حرف زن مت ہوکہ یہ طرز بیاں
راسخ اب دل پہ ہے الماس فشاں

دیدہ نزدیک ہے جیحوں ہووے
خوف ہے یہ جگر خوں ہووے

دے نہ طول اس قدر افسانۂ عشق
کہیں کوتاہ کر افسانۂ عشق

قصیدہ درمدح نواب شمس الدولہ بہادر

اتفاقاً میں رہا رات جو اک دوست کے گھر
طرفہ صحبت رہی لے شام سے تا وقت سحر

گہہ بزرگان سلف کی رہیں باتیں کچھ کچھ
گہہ رہا قصۂ شاہان رعیت پرور

دیر تک ذکر امیروں کا رہا، پر وے امیر
قدرداں اہل ہنر کے تھے جنہوں میں اکثر

یاد آئی جو مجھے رتبہ شناسی ان کی
آنکھیں بھر آئیں مری یوں کہا میں نے رو کر

کہ صد افسوس ممیّز تھے بد و نیک کے جو
اک انہوں میں سے نہیں اب گئے وے لوگ کدھر

دفعتاً اٹھ گئے بازار جہاں سے اے وائے
وے جواہر کے پرکھنے کی جو رکھتے تھے نظر

کب خذف ریزۂ بے قدر کو کہتے تھے لعل
پوتھ کو پوتھ سمجھے تھے گہر کو گوہر

دیکھتے سر پہ کمینے کے اگر زر کا تاج
کفش پا سے بھی ٹھہرتا تھا نظر میں کمتر

خاک آلودہ نظر اہل ہنر گر آتا
اس کو دیتے تھے بہ توقیر جگہ آنکھوں پر

کیا زمانہ تھا کہ تھی ہر اہل لیاقت کی قدر
سنگ گوہر سے نہ ہوسکتا تھا ہرگز ہمسر

وضع داروں سے سبک وضع و بے رہتے تھے
دخل کیا سفلہ چلے محترموں سے بڑھ کر

وہ نسق ہی نہیں بالعکس ہے اس کا اب تو
بے ہنر خوش ہیں خراب اور ذلیل اہل نظر

در بدر خاک بسر پھرتے ہیں ارباب کمال
بے کمالوں کے ہیں ناچار سدا دست نگر

نجبا سے ہے کہیں رتبہ سفیہوں کا زیاد
شرفا سے ہے کہیں رتبہ انہوں کا برتر

قطعہ

ننگ ہیں وے جو حقیقت میں صف پائیں گے
بزم میں صدر نشیں ہوتے ہیں جا کر اکثر

قابل صدر نشینی ہیں مجالس میں جو لوگ
سخت مشکل سے ہے تا صف نعال ان کا گذر

چغد اور بوم نے پایا ہے ہما کا رتبہ
زاغ کے آگے ہے طوطی یوں ہی اک مشت پر

اس زمانے کے بھی کیا مرتبہ واں ہیں یہ امیر
فہم کا ان کی بھلا وصف نہ کیجئے کیوں کر

قلتباں کے تئیں دیں بخش کہ تا نامی ہوں
ہو سلیمان کی انگشت کا گر انگشتر

کوئی محتاج جو سائل ہو تو ہوں چیں بہ چیں
دے کے دشنام کہیں اس کو نکالو باہر

بو علی سامنے گر آکے سلام ان کو کرے
سرسری سے ہوں اسے دیکھ کے کچھ دست بسر

آوے ملنے کو اگر کوئی سفاہت پیشہ
تادر خانہ اسے لانے کو جاویں اٹھ کر

سن کے ان باتوں کو مجھ سے لگا کہنے وہ دوست
جو کہا تو نے نہیں فرق ہے اس میں موبھر

پر یہ مت جان کہ اس عہد میں کوئی نہیں اہل
ایک سے ایک ہیں خوب اب بھی جہاں کے اندر

میں کہا کون ہے کیا اسم شریف اس کا ہے
بولا سن گوش سے تو دل کے رکھ اب گوش ادھر

معدن جود و سخا مخزن الطاف و کرم
مصدر فیض شناسندۂ ارباب ہنر

مہر تابندہ فلک مرتبہ شمس الدولہ
صاحب جاہ و شکوہ و حشم و دولت و فر

سن کے یہ نام میں اس پاس گیا اور پڑھا
سامنے اس کے وہیں مطلع ثانی کہہ کر

مطلع ثانی

بس کہ تو خلق خدا کا ہے معین و یاور
مہرباں کیوں کہ نہ تجھ پر ہو خدائے اکبر

عقدے دل کے ترے وا کیوں نہ ہوں تو نے دل سے
باندھی ہے عقدہ کشائی پہ غریبوں کی کمر

چین سے کیوں نہ تری گذرے کہ تیرے باعث
غربا کرتے ہیں آرام سے عمر اپنی بسر

فرط بخشش کا تری وصف بیاں کیا ہو کہ ہے
روح حاتم کے تئیں اس پہ حسد آٹھ پہر

بخش دے ایک گدا کے تئیں تو وہ ہے کریم
ہفت اقلیم تصرف میں ترے ہووے اگر

اس کے رکھنے کو جگہ کی انہیں رہتی ہے تلاش
اس قدر بخشے ہے محتاجوں کو تو سیم و زر

رشتہ کی طرح جو عریاں نظر آتا ہے تجھے
دے ہے گوہر کا لباس اس کو تو اے دانشور

یاں تلک زر دیا تو نے اسے سائل جو ہوا
کہ سوال اس نے کیا پھر نہ کہیں بار دگر

جرأت ایسی ہے کہ کچھ خوف نہیں واں تجھ کو
رستموں کی ہے جہاں جان کے کھونے کا خطر

تیغ برآں میں تری حد سے زیادہ ہے چمک
برق اس تیغ کی ہے مایۂ تخمیر مگر

سایہ اس کا پڑے گر سر پہ عدو کے تیرے
خودبخود تن سے جدا ہووے وہیں اس کا سر

وصف اسپ

باد پا کی ترے چالاکی کا وصف اے ممدوح
جی میں ہے کیجئے گر ذہن میں کچھ جائے ٹھہر

اسکی آہستہ خرامی کا بیاں کیا ہو حسن
موج دریا اسے کہئے کہ خرام دلبر

جب چلے تند تو پھر تیز روی کو اس کی
پہنچے ہرگز نہ نسیم و نہ صبائے صرصر

عرصۂ دشت امل کے تئیں طے دم میں کرے
جائے اک آن میں صحرائے تخیل سے گذر

برق نازاں ہو بہت تازہ روی پر اپنی
پہنچے نزدیک اگر اس کے کبھو گر پڑ کر

ہو سکے مجھ سے کہاں وصف عدالت کا تری
نہیں عالم میں کوئی تجھ سا عدالت گستر

تو وہ عادل ہے کہ یہ عدل قوی پنجہ ترا
ظلم کا چاک گریبان کرے سر تا سر

ناتوانوں کو جلادے کوئی کس کا مقدور
نہ جلے رکھئے جو خاشاک پہ سوزان اخگر

کھینچ لے شیر کا روباہ ترے حکم سے پوست
ایک مو کا ہو گر اس کے کہیں نقصان وضرر

گھر کی اس کے ہو وہیں بیخ کنی اک دم میں
کاٹے بے حکم ترے کوئی اگر شاخ شجر

زہے تو راضی و خوشنود ہے تجھ سے ہر ایک
کون ایسا ہے جو ہے ذات سے تیری بدبر

تیری شفقت نے مسخر کیا عالم کے تئیں
کیوں نہ ہوں تیرے تصرف میں دلوں کے کشور

ہیں جو انسان سو ممنوں ہیں ترے احساں کے
جو نہیں ہیں ترے مشکور نہیں ہیں وہ بشر

وصف تیرے ہوں بیاں مجھ سے کہاں خاطر خواہ
فکر فرصت نہیں دیتی کہ سخن کیجئے سر

بیتیں کتنی یہ پریشاں سی کہیں ہیں میں نے
زور سے طبع پراگندہ کو لایا ہوں ادھر

تیرا مداح تو ہوں لیک سراپا غم ہوں   کیا کروں شرح پریشانی حال ابتر
چشم قربانی کی مانند ہوں حیراں ہمہ تن   دل ہوں مفلس کا پریشان ہوں میں سر تا سر
ربط کچھ بالش و بستر سے بھی باقی نہیں اب   سوؤں ہوں اوڑھ کے مہتاب کی شب کو چادر
آہ صدموں سے غموں کے ہوں زخود رفتہ سدا   محو اندوہ ہوں ایسا کہ نہیں اپنی خبر
ہے نشا طرفہ مرے سر میں کہ پیتا ہوں میں   ہر سحر اوٹھ کے مئے خون جگر کا ساغر
کثرت غم سے دل از بس کہ ہے ویران وخراب   کیا کہوں گذرا ہے اس راہ سے گویا لشکر
داغ پر داغ ہیں سینے میں ستاروں کی طرح   آسماں غم کا غرض ٹوٹ پڑا ہے مجھ پر
راسخ اب ختم قصیدہ کو دعا پر کر تو   طول دینا نہیں اس درجہ سخن کا بہتر
دوست تیرے رہیں خوش حال سدا اے ممدوح   مبتلا غم میں رہیں تیرے عدو تا محشر
اختر اقبال کا تیرے رہے تاباں تب تک   جب تلک نور سے لبریز رہیں شمس و قمر

مرثیہ

آہ دسویں دن محرم کے یہ کشت و خوں ہوا   تختۂ دامان ارض ماریہ گلگوں ہوا
کیوں نہ ہو بے آب جب ایسا دُر مکنوں ہوا   جس کی بے آبی سے سالار رسل محزوں ہوا
جذب کی طاقت عطا ہوئی کربلا کی خاک کو
ورنہ جوش خوں ڈباتا کشتیٔ افلاک کو
اس وقوع کشت وخوں سے مجھ کو حیرانی تھی ہائے   کثرتِ افکار سے خاطر پریشانی تھی ہائے
سینہ جوشاں تھا غموں کی ایک طغیانی تھی ہائے   چشم سیلِ اشک سے کشتیٔ طوفانی تھی ہائے
روتے روتے لگ گئی تھیں ہچکیاں میرے تئیں
کشف ہوتا تھا نہ یہ سرّ نہاں میرے تئیں
کیوں نہ آہ اس سوچ میں اپنا گریباں چاک ہو   روکش و ریا نہ کیوں کہ دیدۂ نمناک ہو
خلق ہونا جس کا وجہ خلقت افلاک ہو   دال جس کی ارتفاع شان پر لولاک ہو
خنجر برّاں ہو اور اس کے نواسے کا گلا
کاٹ کر اپنا گلا یاں تو ہے مر جانے کی جا
اس کے بحر کشف میں بیتاب و مستعجل ہوا   کچھ کھلے اس واسطے سوئے کتب مائل ہوا
لیک اطمینان جب مجھ کو نہ کچھ حاصل ہوا   تب جناب حضرت دل ہی سے میں سائل ہوا
دل نے فرمایا کہ مستفسر ہو مت اس راز کا
آہ طولانی ہے یہ قصہ نیاز و ناز کا

کیا کہوں احوال خاصانِ حریمِ قرب یار   سب بلاکش ہیں نہیں ہے بن بلا ان کو قرار
اک بلائے تازہ کا ہر دم ہے ان کو انتظار   گر نہ وارد ہو بلا کوئی تو ہو اک انتشار
گونہ گونہ ابتلا ہے انبیا کے واسطے
آہ سختی بلا ہے اولیا کے واسطے

عاشقان حق سے ہیں موسیٰؑ وعیسیٰؑ وخلیلؑ   مدعی دوستی حق ہے یہ زمرہ جلیل
ہے بہت مشکل گذر یہ عشق بازی کی سبیل   کس طرح اثبات ہو دعویٰ نہ جب تک ہو دلیل
کھینچنا رنج و بلا کا عاشقی کا ہے نشاں
دوستی ثابت کہاں گر ہو نہ اس کا امتحاں

احمد مرسل کہ ہے وہ سرگروہِ عاشقاں   سب سے افزوں تر ہے دعویٰ دوستی کا اس کو ہاں
اس لیے تیر بلا کا ہی رہا ہر دم نشاں   واقعہ اک تازہ ہی درپیش اسے تھا ہر زماں
اکملان عشق پر یہ رنج و محنت چاہئے
امتحاں یعنی بہ مقدار محبت چاہئے

اس کا وہ پیارا نواسہ نام ہے جس کا حسینؑ   حاملِ رنج و مصیبت مرتضیٰؑ کا نور عین
تشنہ لب مظلوم وبیکس فاطمہؑ کے دل کا چین   پیشوائے عاشقانِ حق امامِ مشرقین
مدعی عشق ایسا تھا کہ کوئی ایسا نہ تھا
اس لیے منظور اس کا امتحاں کیا کیا نہ تھا

مار ڈالے پہلے فرزندان سرور کے تئیں   پیش تیغ و تیر رکھا اکبر و اصغر کے تئیں
ہائے صحرا میں پھرایا عابد مضطر کے تئیں   خیمہ لٹوایا جلایا اس کے سارے گھر کے تئیں
زیر خنجر ہائے وہ تشنہ دہاں آخر ہوا
سر دیا لیکن نہ کار امتحاں آخر ہوا

ہائے بعد قتل اسے پھر امتحاں درپیش تھا   سر کو اس کے صدمۂ نوک سناں درپیش تھا
جابجا سرگشتگی نقل مکاں درپیش تھا   جانا اس صورت سے پیش دشمناں درپیش تھا
دوستی کا حق ادا کر نقد جاں وہ دے گیا
راستی یہ ہے کہ داد امتحاں وہ دے گیا

سابقیں پر لے گیا سبقت وہ دیں کا بادشاہ   اس روش محبوب سے کی اپنے پیدا کس نے راہ
بڑھ گیا کتنا نیاز و ناز کا قصہ بھی واہ   ہاتھ میں یاں سر رہا واں تیغ رانی کی ہے چاہ
نے نیاز عشق کی غایت نہ کچھ پایانِ ناز
اللہ اللہ عاشق و معشوق کا ناز و نیاز

عام کیا کیا ذکر ہے وے ہیں جو خاصان حریم   ان کو بھی ہے مرتبہ پر اس کے اک رشک عظیم
کس کو دیتے ہیں یہ نفس مطمئن طبع سلیم   مبدع فیاض گو ہے صاحب فیض عمیم
پر وہ رتبہ ہے جو تخصیص حسینؑ ابن علیؑ
اس میں شرکت نہ نبی رکھتے ہیں نہ ہرگز ولی

یہ حقائق حضرت دل سے کئے میں نے گوش   وجد کی حالت بہم پہنچی زہے جوش وخروش
جی میں کہتا تھا کہ یہ کیا ہے بجا رکھ اپنے ہوش   دل کی اس آواز کو سمجھا میں آواز سروش
تہ کو پایا راز کے مجھ مضطر و ناشاد نے
کی تسلی میری مرشد کے مرے ارشاد نے

یا حسینؑ ابن علیؑ یا سید عالی جناب   آسماں مجھ کو کیا چاہے ہے اب لذت کا باب
دربدر کب تک پھروں یوں آہ با حال خراب   منت نااہل سے ہے دل کو رنج بے حساب
تم ہو فرزند علیؑ راسخ علیؑ کا ہے غلام
پرورش عبد پدر کی ہے پسر پر یا امام

مخمس

آہ مت بار علائق سے گراں بار رہو　　کوچ کچھ دور نہیں چلنے کو تیار رہو
ترکِ غفلت کرو اے غافلو ہشیار رہو　　یہ سرا سونے کی جا گہ نہیں بیدار رہو
ہم نے کردی ہے خبر تم کو خبردار رہو

ترک ہم شوق کے ماروں سے ہو کب مطلب کا　　کیوں نہ مشتاق ہو دل بوسۂ کنج لب کا
طرز زیبائی یہ کچھ حسن ادا اس ڈھب کا　　آپ تو ایسے بنے وے کہ چلے جی سب کا
ہم کو کہتے ہیں کہ تم جی کے تئیں مار رہو

جو نہاں خانۂ خاطر میں ہے دو اس کو پھیک　　غوطہ زن ہی رہو اس بحر میں ہستی کے ہر ایک
کر و غواصی، عمل ہے یہی اے یارو نیک　　گرچہ وہ گوہر تر ہاتھ نہیں آتا لیک
دم میں دم جب تئیں ہے، اس کے طلب گار رہو

چاہئے زخم نمک سود رہے سینے کا　　ہے عجب ذائقہ غم کھانے، لہو پینے کا
آپ کو محو رکھو، حسن کے آئینے کا　　لاگ گر جی کی نہیں، لطف نہیں جینے کا
الجھی الجھی کسی کاکل کے گرفتار رہو

ہے متاعِ دل غم دیدہ بہت ذی توقیر　　یہ وہ ہے جنس کہ عالم میں نہیں جس کا نظیر
ہوگئے اس کی خریداری میں راسخ تو فقیر　　سارے بازار جہاں کا ہے یہی مول اے میر
جان کو بیچ کے بھی دل کے خریدار رہو

❋

واسوخت

وہی دن خوب تھے جو خرم و دل شاد تھے ہم　　کبھو مائل نہ سوئے نالہ و فریاد تھے ہم
یوں نہ دیوانۂ خوبان پری زاد تھے ہم　　کاہے کو روکش عشق ستم ایجاد تھے ہم
ہم کو چاہت کا کچھ ارمان نہ تھا چاؤ نہ تھا
سلجھے بالوں سے کسو کے ہمیں الجھاؤ نہ تھا

نہ بچھایا تھا محبت نے ہمارے لیے دام　　صبح اپنی نہ کسو زلف کی تھی دھیان میں شام
جی میں پھرتی نہ تھی اپنے کسو کی طرز خرام　　تھا نہ منظور ہمارا کوئی خوش قد خود کام
اب تو چشم آئینہ دار رخِ محبوباں ہے
دل اسیر روشِ دلبریٔ خوباں ہے

حسن والوں کی طرف طبع بہت آئی ہے　　چشم و ابرو ہمیں ان دلبروں کی بھائی ہے
اب کہاں ہم کو سرگوشۂ تنہائی ہے　　شوق نے آگ سی اک سینے میں بھڑکائی ہے
پہروں دروازے پہ مجنون سے جا بیٹھتے ہیں
جوگیوں کی سی طرح دھونی لگا بیٹھتے ہیں

خون کیا ایک جفا جو نے جگر مت پوچھو　　رو و مو اس کے ہیں محبوب نظر مت پوچھو
آنکھیں رہتی ہیں مری اشک سے تر مت پوچھو　　زیب دامان مژہ ہیں یہ گہر مت پوچھو
مجھ سے گو وہ مہ بے مہر جدا رہتا ہے
داغ اس کا مری چھاتی سے لگا رہتا ہے

دیدۂ تر ہوئے ہیں دوری سے اس کے ناسور　　امتحاں صبر کا میرے ہے اسے واں منظور
یہی لکھ بھیجتا ہے خط میں مجھے از رہ دور　　کہ تجھے صبر کا دعویٰ ہے بہت اے مغرور
جھوٹ ہے صبر کا کب دعویٰ کیا ہے میں نے
آہ کب نام شکیبائی لیا ہے میں نے

میں کہاں صبر کہاں مجھ پہ تو یہ تہمت ہے　　صدمہ ہجر اٹھانے کی کسے طاقت ہے
امتحاں ہائے تحمل کا بڑی آفت ہے　　یہ نئے ڈھب ہیں ستانے کے عجب صحبت ہے
آہ کب تک ستم تازہ سہا جاوے گا
جی مرا جاوے گا اس شوخ کا کیا جاوے گا

دوستو کام تغافل کو نہ اب فرماؤ　　پاس ٹک اس مہ بے مہر کے میرے جاؤ
مجھ تلک اس کو بہ منت بہ سماجت لاؤ　　کہو یہ بات کہ راسخ کو چلو دیکھ آؤ
تم نے تو اپنی جدائی سے کیا اس کو داغ
اب وہ دل سوختہ مہجور ہے بجھتا سا چراغ

قطعات

ہائے رے عشق ہائے رے پرکار
وہ تن لاغر فقیر نزار
جز و تن اس پری کا اس صورت
برگ میں گل کے رگ ہو جس صورت

☆☆

ہاں محبت کے رنگ کی کیا بات
اس گلِ تر کے وے نگاریں ہات
نازکی تھی جنھوں کی گل سے بیش
ہار سے زیب گردن درویش

☆☆

تھی مطبخ پہ جنکے ہر اک کی نظر
کھلاتے تھے بھیو کیوں کو طوائے
سوئے بے زری سے ہوئے ہیں ہم تباہ
کہ وے سائل نان خشک اب ہیں آہ

☆☆

اندیشہ قوت کے سبب سے
تنگیِ معاش کے تعب سے
نظروں میں جہان پر نور
ہے تنگ تراز گذر گہہ مور

☆☆

بھٹکا اک عمر بھول کر راہ
ابرا اور بگولے کی طرح آہ
گہہ خاک فشاں گہہ اشک ریزاں
ہمرہ غم فرقت عزیزاں
اس شکل کہاں کہاں پھرا ہوں
میں ہم تگ صر صر و صبا ہوں

☆☆

پیدا کیا ہے تجھ کو خالق نے بعد حاتم
وہ کامل الٰہم تھا بے شبہ تو ہے اکمل
اس میرے قول کا ہے شاہد یہ مصرع چست
نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل
مجمل ہے یہ جو قید تحریر میں ہے آئی
راسخؔ سے مدح تیری کب ہو سکی مفصل
تیرا چراغ ہستی تب تک ہے منور
روشن ہے آسماں پر جب تک یہ مہہ کی مشعل

☆☆

عشق کرنا ہی نہ تھا کیا کیا تم نے راسخؔ
صاحب اس عاشقی سے ہاتھ اٹھایا ہوتا
مرگ یک بارہ بھلی مرنے سے ہر ساعت کی
جی دیا ہوتا ولے دل نہ لگایا ہوتا

☆☆

زہے نیچے ہیں وہ شرماتی آنکھیں
انہوں نے بھر نظر مجھ کو نہ تاکا
نہ دیکھا گو ادھر پر مار رکھا
غرض کشتہ ہوں میں ان کی حیا کا

☆☆

آب و رنگ چمن عشق ہوں پیری میں بھی
ہے مجھے گریۂ پیہم سے سروکار ہنوز
لختِ دل سے مژہ پھولوں کی چھڑی ہے اب تک
موتیوں کی ہے لڑی آنسوؤں کا تار ہنوز

☆☆

کیسہ جواہری کا ہے راسخؔ یہ میری طبع
خامہ مرا کہے ہے کہ گوہر فشاں ہوں میں
کم وزن ہے بہت زر دعویٰ مدعی
ہووے خفیف گر بسر امتحاں ہوں میں

☆☆

دیر و حرم کہاں کا، عرش بریں ہے کیسا
مطلوب کس طرف ہے، غفلت سے تو کدھر ہے
جویا اگر ہے ان کا جا تا دل شکستہ
وے ہیں اسی میں یہ جو ٹوٹا ہوا سا گھر ہے

❋

مجہول الاسم شاعر مسافرؔ کی ہتک آمیز غزل پر راسخؔ کی ہجو

(کلکتہ کے ایک مشاعرے میں کہی گئی تھی)

اے ننگ رتبہ جہلائے مشاعرہ   تو ہووے روکش فضلائے مشاعرہ
تو اور یوں کہے ہے بجائے مشاعرہ   دیدیم مجمع کبرائے مشاعرہ
کم نیست از مکابرہ جائے مشاعرہ

ہے وسعت سخن سے تجھے آگہی کہاں   نہ قافیہ کا علم تجھے نہ عروض داں
ہے دال تیرے جہل پہ تیرا یہ قول ہاں   مرکب جہاندہ اند بہائم شریر تاں
در تنگنائے قافیہ ہائے مشاعرہ

طفلان نے سوار کا تو اے ذلیل و خوار   بازیچہ بن گیا ہے زہے عزت و وقار
کہتا ہے اس وقار پر اے ننگ ننگ و عار   برپائے من جہند چوں طفلان نے سوار
پیران بوالہوس بہ ہوائے مشاعرہ

واں قہر ہے کہ آن کے ہوں خود پسند جمع   جس بزم ہوشمند جمع
ہوں چار پانچ تجھ سے سفیہ و لوند جمع   صد تیشہ ہائے فکر پریشاں کنند جمع
کز پادر آورند بنائے مشاعرہ

پوچھو اصولِ قافیہ تو یوں کرے کلام   ہے اک کتاب کافیہ ہے گا اسی کا نام
اس علم پر کہے ہے تو اے زادۂ حرام   دارند جہتے ز سرِ فکرِ ناتمام
بر جہل خوی ایں علمائے مشاعرہ

مجلس میں شاعروں کی کیا تو نے کیوں گذر   اس اپنے جہل پر تجھے ہرگز نہیں نظر
سمجھا ہے علم شعر کو تو سہل کس قدر   بازیچہ است در نظر سفلگاں مگر
انداز شاعری و ادائے مشاعرہ

اس عہد میں ہیں جتنے سخن دان ہوشمند   کہتے ہیں تیری ریش کو سب پشم اے لوند
جھنجھلا کے گو کہے تو گر آواز کو بلند   موئے زہاد و ریش ز یک جنس بشمرند
ہیں موشگافی شعرائے مشاعرہ

حیوانیت ہے تجھ میں تو اے بوم ہے بھری   بس آتے ہی ترے ہوئی مجلس کی ابتری
آتا مشاعرے میں نہ کاش ایسا مفتری   معدوم شد ہما ز جہانِ سخنوری
تا بوم سایہ زد بہ فضائے مشاعرہ

خالی ہے بزم انہوں سے سخن جن کا ہے سند   پوچھے ہے تجھ چباولے چڑیا کو کوئی کد
سن شعر تیرے کہتے ہیں سب اے ہمہ حسد   کنجشک ہیں کہ چوں پر پرواز می زند
با شاہباز اوج گرائے مشاعرہ

آواز دل خراش تیری ہے وہ پُر گزند   جس سے صدائے زاغ ہے خوشتر ہزار چند
تو نے پڑھے جو شعر تو سب بولے اے لوند   در مجلس سخن شدہ شورِ زغن بلند
کو عندلیب تازہ نوائے مشاعرہ

اس جہل پر نہیں تجھے زیبندہ فکر شعر   بھڑوے تو شعر مکر کو کہتا ہے بکر شعر
کرتا ہے اہل علم کا اس طرح ذکر شعر   شد حاجتش قضا چوں نمازش بفکر شعر
شیخے کہ ریش زد بہ فضائے مشاعرہ

نفریں ہے تجھ پہ اے خس صحرائے جاہلی   ہے جس کا علم و فضل مداوائے جاہلی
تو اس کو یوں کہے ہے باغوائے جاہلی   دیگر شمردہ مفت بہ فتوائے جاہلی
تحسین شعرش از جہلائے مشاعرہ

اے فضلۂ سگانِ نجس خوار خوک وش   فاضل تمام جس کی فضیلت پہ ہیں کے غش
تو اور اس کو یوں کہے اے سفلہ بادکش   نازم بایں مشیخت و دستار وریش وفش
ہیں بوالفضولی از فضلائے مشاعرہ

انسانیت سے بہرہ تجھے حیف کچھ نہیں   وہ شخص ہے جو فاضل و ہم شاعر و متیں
کہتا ہے اس کی شاں میں تو اے حاسدلعیں   ایں بوم دیں کہ شد متخلص بہ بوالمدیں
چوں زاغ می پرد بہ ہوائے مشاعرہ

ہوں فن شاعری میں کما ہی جو بہرہ مند   ہو عرش سیر جن کے خیالات کا سمند
ان کی جناب میں یہ کہے تجھ سا خود پسند   با پست فطرتی نہ رسد معنی بلند
اے ابلہان بے سر و پائے مشاعرہ

ہے آرزو طپش کی کہے تیرا مرثیہ   تجھ سا کثیف تن ہے سزاوار باویہ
جان سخن کو تو کہے یہ حرف واہیہ   در جان طپش فتادہ شدش تنگ قافیہ
کو شد ردیف اے سفہائے مشاعرہ

افسوس کا بھی دل ہے ترے ہاتھوں ریش ریش   بیزار تیری شکل سے رہتا ہے وہ ہمیش
کب ان نے یہ کہا جو کہے ہے تو فتنہ کیش   افسوس بیں چہ گفت بجا حسب حال خویش
کیں ناسزا نبودہ سزائے مشاعرہ

ہے بام ان کے قصر سخن کا بہت بلند   کب فہم نارسا کی تری پہنچی واں کمند
ناداں عبث کہے ہے تو یہ حرف ناپسند   دانا نہ بلکہ ہیچ مداں کردہ ریش خند
بر نکتہ سنجیٔ فصحائے مشاعرہ

اول تو تھی مشاعرہ میں کچھ تری نشست   اٹھوادیا ولے تجھے جب اے غرور مست
کھا پیچ تاب یوں کہا تب تو نے خود پرست   خوش حال قامع کہ بار او بی درست
از دام حرص بند بلائے مشاعرہ

پڑھتا تھا شعر اپنے جو تو کر صدا بلند   کرتے تھے گوش فاضل وشاعر سب اپنے بند
کہتا تھا زیر لب یہی ہر ایک ہوشمند   زیں پس سزد کہ مہر خموشی بلب زنند
ایں واہیانِ ہرزہ درائے مشاعرہ

گم رہ کجیٔ طبع سے ہیں تجھ سے راہ رو   مسقوم ہیں گے شعر تیرے دس ہوں یا ہوں سو
کچھ ان میں تازگی نہیں ہوں کہنہ یا ہوں نو   باز آ مسافرا کہ نیر زد بہ نیم جو
قلب تو ہم بہ بیع و شرائے مشاعرہ

ختم شد